

سائخه كرىلا

ڊاڪٽر اسرار احمد

مرڪزى انجمن خدام القرآن
لاهور

ہجری سالِ نو

از

ساختہ کر بلا

از

ڈاکٹر اسرار احمد



ترتیب و تسوید: (شیخ) جمیل الرحمن

مع

کر بلا کی کہانی

حضرت ابو جعفر محمد باقرؑ کی زبانی

ترجمہ از مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی

نافع کزوہ:

مکتبہ خدام القرآن لاہور

تقدیم

(۱۹۸۳ء)

حسین اتفاق سے یکم محرم الحرام ۱۴۰۲ھ یعنی پندرہویں صدی ہجری کے دوسرے سال کا ”نوروز“ جمعہ کا دن تھا۔ اس مناسبت سے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مسجد دارالسلام بارغ جناح لاہور میں اپنے خطاب جمعہ میں جو اہم باتیں ارشاد فرمائیں وہ ماہنامہ ”یثاق“ میں ”ہجری سال نو مبارک“ کے عنوان سے شائع ہو گئی تھیں۔

پھر اسی سال ۸ محرم الحرام کو ڈاکٹر صاحب نے ”سانحہ کربلا کا تاریخی پس منظر“ کے عنوان سے مفصل خطاب فرمایا جو ”یثاق“ بابت دسمبر ۱۹۸۱ء میں شائع ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی واقعات کربلا کے ضمن میں ایک طویل روایت کا ترجمہ بھی شائع کر دیا گیا تھا جو حضرت زین العابدین علی بن حسینؑ کے صاحبزادے اور حضرت جعفر صادقؑ کے والد ماجد حضرت محمد باقرؑ سے مروی ہے۔

”یثاق“ کی اس اشاعت کی مانگ بہت زیادہ ہوئی تھی یہاں تک کہ اب اس کا کوئی نسخہ دفتر میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ احباب کے تقاضوں کے پیش نظر اب ان تینوں کو یکجا کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

توقع ہے کہ ان شاء اللہ العزیز یہ کتابچہ ان مغالطوں اور غلط فہمیوں کے ازالے میں مدد و معاون ثابت ہوگا جو ماہ محرم الحرام اور شہادت سیدنا حضرت حسینؑ کے ضمن میں عوام و خواص میں پائی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق کو پہچاننے اور اسے ذہناً و قلباً قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

ناظم نشر و اشاعت

ہجری سالِ نو مبارک

۱۳۰ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو جمعہ کا دن اور محرم الحرام ۱۴۰۲ء کی یکم تاریخ تھی۔ اس روز مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے خطابِ جمعہ میں جو موضوع گزشتہ دو ماہ سے چل رہا تھا یعنی "نظامِ سیاست و حکومت سے متعلق قرآنی تعلیمات" اُس پر گفتگو سے قبل نئے ہجری سال کے آغاز کی مناسبت سے جو کچھ فرمایا وہ درج ذیل ہے۔ (مرتب)

نَحْمَدُكَ يَا رَبِّ الْعَالَمِينَ
فَأَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فَأَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
قَالَ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ فِي سُورَةِ الْبَقَرَةِ: ﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ﴾

وَقَالَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى فِي سُورَةِ آلِ عِمْرَانَ: ﴿وَلَا تَحْسِبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ﴾

أَمَا بَعْدُ: ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۖ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۖ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي ۖ يَفْقَهُوا قَوْلِي﴾

اللَّهُمَّ أَهْلَةً عَلَيْنَا بِالْأَمْنِ وَالْإِيمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْإِسْلَامِ
اللَّهُمَّ مَنْ أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَى الْإِسْلَامِ ۚ وَمَنْ تَوَلَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَلَّهُ عَلَى الْإِيمَانِ آمِينَ يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ!

حضرات! آج یکم محرم الحرام سن ۱۴۰۲ ہجری ہے۔ گویا آج پندرہویں صدی کے دوسرے سال کا پہلا دن ہے۔ لہذا سب سے پہلے تو میں اسلامی تقویم کے اعتبار سے اس نئے سال کی آمد پر آپ کی خدمت میں ہدیہ تمہیک پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ سال ہمارے لئے امن و امان اور سلامتی و اسلام کا سال ثابت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آغاز میں وہ دعا پڑھی ہے جو نبی کریم ﷺ ہر ماہ کے لئے نئے چاند کے طلوع ہونے پر پڑھا کرتے تھے یعنی اَللّٰهُمَّ اِهْلِنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِيْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ جس کے آخر میں آنحضرت ﷺ یہ بھی فرمایا کرتے تھے: ”رَبِّسِيْ وَرَبِّكَ اللّٰهُ۔ هِلَالُ رُشْدٍ وَخَيْرٍ“ اس دعا کے تین حصے ہیں۔ اصل دعا تو پہلا حصہ ہے کہ ”اے اللہ! اس چاند کو ہم پر امن و ایمان اور سلامتی و اسلام کے ساتھ طلوع فرما۔“ دوسرے حصے میں چاند سے خطاب ہے۔ اس میں دراصل مشرکانہ ادہام اور عقائد کی نفی اور ابطال ہے جو چاند، سورج اور اجرام فلکیہ کے بارے میں بالعموم لوگوں کے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں۔ لہذا آنحضرت ﷺ یہ فرمایا کرتے تھے: رَبِّسِيْ وَرَبِّكَ اللّٰهُ یعنی ”میرا رب بھی اللہ ہے اور اے چاند تیرا رب بھی اللہ ہے۔“ تیسرا حصہ ایک نوید اور خوشخبری بھی ہے اور اس میں ایک دعائیہ پہلو بھی ہے: هِلَالُ رُشْدٍ وَخَيْرٍ یعنی یہ ہلال جو طلوع ہوا ہے یہ رشد اور خیر کا ہلال ہے۔ یہاں ”ہے“ بھی ترجمہ ہو سکتا ہے اور ”ہو“ بھی ترجمہ ہو سکتا ہے۔ اگر اول الذکر ترجمہ کیا جائے تو یہ نوید و خوشخبری ہے اور اگر مؤخر الذکر ترجمہ کیا جائے تو یہ دعا ایک تمنا اور خواہش کا اظہار ہے۔ کل جو ہلال طلوع ہوا ہے اس سے صرف ایک نیا مہینہ ہی شروع نہیں ہوا بلکہ نیا اسلامی و ہجری سال بھی شروع ہوا ہے۔ لہذا ہمیں یہ دعا کرنی چاہئے کہ اے اللہ! اس سال کو نوع انسانی کے حق میں بالعموم اور مسلمانان عالم کے حق میں بالخصوص اور اس خطہ ارضی کے حق میں جو تو نے اسلام کے نام پر ہمیں عطا فرمایا تھا اور جو مملکت، خداداد پاکستان کہلاتا ہے، خاص الخاص طریق پر اپنے فضل اور اپنی رحمت سے امن و سلامتی کا سال بنا اور اس سال میں ہمارے ایمان اور اسلام میں حقیقی رنگ پیدا فرما۔ میں نے مزید یہ دعا بھی کی ہے کہ

اس سال کے دوران تیرے علم کامل میں جن کی وفات کا وقت قریب آ رہا ہو اے اللہ!
ان کو ایمان پر وفات دیجیو اور جن کے لئے تیرے علم ازلی میں مزید مہلت عمر طے ہو ان
کو اسلام پر قائم رکھیو۔ اَللّٰهُمَّ مَنْ اَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَاحْيِهِ عَلٰى الْاِسْلَامِ، وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا
فَتَوَفَّهُ عَلٰى الْاِيْمَانِ۔

اس موقع پر ایک جملہ معترضہ کے طور پر مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ محرم الحرام کے
مہینے کو ہم نے ایک مخصوص کتب فکر کے زیر اثر بلا سبب اور قطعی نامناسب طور پر رنج و غم
اور حزن و اَلَم کا مہینہ بنا لیا ہے، حالانکہ کسی بھی اعتبار سے یہ مہینہ ہمارے لئے رنج و غم کا
مہینہ نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سال کا کوئی مہینہ بھی دینی لحاظ سے رنج و غم کا مہینہ
نہیں ہے۔ یوم عاشوراء (۱۰ محرم الحرام) کی جو اہمیت ہمارے ہاں ہے اس میں
ہمارے دینی تصورات و عقائد کے لحاظ سے عظمت کا پہلو ہے۔ اس ضمن میں بہت سی
احادیث صحیحہ کتب احادیث میں موجود ہیں۔ نبی اکرم ﷺ اس دن جو روزہ رکھتے تھے
تو اس کی کوئی بنیاد اور تعلق حادثہ کربلا سے نہیں ہے۔ یہ حادثہ تو نبی اکرم ﷺ کی الرفیق
الاعلیٰ کی جانب مراجعت کے نصف صدی سے بھی زائد بعد پیش آیا ہے۔ لہذا دینی لحاظ
سے اس حادثے کا یوم عاشوراء سے کسی تعلق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صوم عاشوراء
کے متعلق جو متفق علیہ حدیث ملتی ہے یعنی سند کے اعتبار سے جس کی صحت پر امام بخاریؒ
اور امام مسلمؒ جیسے جلیل القدر محدثین اتفاق کر رہے ہوں اور جس کے راوی ہیں حضرت
عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما، جو آنحضرت ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ
دونوں کے چچا زاد بھائی ہیں اور جو گویا حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے رشتے کے
چچا بھی ہیں اور نانا بھی۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ
تشریف لائے اور آپؐ نے دیکھا کہ مدینہ کے یہود ۱۰ محرم الحرام کو روزہ رکھتے ہیں تو
آپؐ نے یہود سے دریافت فرمایا کہ ”تم یہ روزہ کیوں رکھتے ہو؟“ انہوں نے بتایا کہ
”یہ دن ہمارے لئے بڑی خوشی کا دن ہے اس لئے کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت
موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو آل فرعون کے ظلم و استبداد سے نجات دلائی تھی اور

فرعون اور اس کے لشکر کو جو تعاقب میں تھا، غرق کیا تھا، لہذا ہم شکرانے کے طور پر یہ روزہ رکھتے ہیں۔ اس پر آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”تمہاری نسبت (حضرت) موسیٰ کے ہم زیادہ حق دار ہیں۔ یہود نے تو اس کو ایک قومی دن کا درجہ دے رکھا ہے، حالانکہ یہ دن دین اسلام کی تاریخ کا ایک تابناک باب ہے اور دین اسلام کی تاریخ تو حضرت آدم ﷺ سے شروع ہوتی ہے۔ اسی موقع پر آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ ”ہم اس دن کا روزہ رکھنے کے زیادہ حق دار ہیں۔“ چنانچہ اس وقت سے آنجناب نے دس محرم الحرام کا روزہ رکھنا شروع فرمادیا۔

ویسے بھی اس بات کو اچھی طرح جان لیجئے کہ ہمارے دین میں ”شہادت“ کا معاملہ کوئی رنج و غم والی بات ہے ہی نہیں، بلکہ یہ تو ایک مردِ مومن کے لئے فوز و مرام اور فلاح و کامرانی کا بلند ترین اور ارفع و اعلیٰ مقام ہے۔ دلیل کے لئے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۰۴:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿۱۰۴﴾﴾

یعنی ”جو اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ یہ لوگ (تو حقیقت میں) زندہ ہیں مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور حاصل نہیں۔“ اور سورۃ آل عمران کی آیت ۱۶۹:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزُقُونَ ﴿۱۶۹﴾﴾

یعنی ”جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کو مردہ خیال نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اپنے رب کے پاس سے روزی پارہے ہیں“ کو پیش نظر رکھئے۔ ان مقتولین کی برزخی زندگی میں حیات اور اس میں رزق پانے کی کیفیات امورِ غیب سے متعلق ہیں لہذا اس کا کوئی تصور و شعور اس عالمِ ناسوت میں ہمارے لئے ممکن نہیں۔

شہادت فی سبیل اللہ وہ سعادتِ عظمیٰ اور چوٹی کا وہ عمل ہے کہ جس کے لئے انبیاء و رسل علیہم السلام تمنا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح احادیث میں آنحضرت ﷺ کی دو دعائیں منقول ہیں۔ ایک یہ کہ:

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْتَلِكُ شَهَادَةَ فِي سَبِيلِكَ

اور دوسری یہ کہ:

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ شَهَادَةً فِيْ سَبِيْلِكَ

مزید بر آں آنحضرت ﷺ کا یہ قول بھی احادیث میں منقول ہے:

((لَوْ دِدْتُ اَنْيْ اُقْتَلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلَ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلَ)) (متفق علیہ)

”میرے دل میں بڑی آرزو اور بڑی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں، پھر مجھے زندہ کیا جائے، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں۔“

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ رسول قتل نہیں ہوتے، اس لئے کہ اس طرح عالم ظاہری میں رسول کی مغلوبیت کا پہلو نکلتا ہے، لیکن اس حدیث سے مرحبہ شہادت کے رفیع و مہتمم بالشان ہونے کا اندازہ لگا لیجئے۔ علاوہ ازیں نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بھی ملاحظہ کیجئے:

((مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهُ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنَ النِّفَاقِ)) (مسلم و ابوداؤد)

”جس مسلمان کی موت اس حال میں آئی کہ نہ اس نے کبھی اللہ کی راہ میں جنگ کی اور نہ ہی اس کے دل میں راہ حق میں سرکٹا کر سرخرو ہونے کی تمنا اور نہ پیدا ہوئی، اس کی موت ایک قسم کے نفاق پر واقع ہوئی۔“

پس شہادت ہر گز رنج و الم، سوگ اور ماتم کرنے والی چیز نہیں ہے۔

اگر شہادت رنج و غم اور الم و ماتم والی شے ہوتی تو دور نبویؐ اور دور خلافت راشدہ کی تاریخ میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جس میں کوئی نہ کوئی عظیم شہادت وقوع پذیر نہ ہوئی ہو۔ اگر شہادت میں رنج و غم اور ماتم کا پہلو تلاش کریں تو حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شہادت کا دن بھی ماتم کے دن کے طور پر منانا ہوگا۔ یہ بڑی عظیم شہادت ہے۔ توحید کے لئے یہ پہلا خون بہا ہے جس سے مکہ مکرمہ کی زمین لالہ زار ہوئی اور کس بہیمانہ طریقے پر کہ ابوجہل نے تاک کر اندام نہانی پر نیزہ مارا ہے جو پشت کے پار ہو گیا۔ پھر ان کے شوہر حضرت صیامر رضی اللہ عنہ کی عظیم شہادت ہے جس کے متعلق بعض

روایات میں آتا ہے کہ ابو جہل اور اس کے شقی القلب ساتھیوں نے حضرت یاسرؓ کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیرسیوں سے باندھے پھر چہار سمت میں چار اونٹ کھڑے کر کے یہ رسیاں اونٹوں کی ٹانگوں سے باندھ کر ان کو ہانک دیا گیا اور حضرت یاسرؓ کے جسم پر زخمیں پڑیں۔ ہر سال ہر چہار ماہ میں یہ ہے نہ احصاء بریدہ (مسند شدہ) ہیں، شکم چاک ہے، کلیجہ نکال کر چبانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب اگر ہر سال سوگ کا دن منایا جاتا اور ماتم کیا جاتا تو ان کی شہادت پر کیا جاتا۔ پھر دیکھئے کہ حضرت زید بن حارثہ، حضرت جعفر طیار بن ابی طالب، حضرت عبد اللہ بن رواحہ، حضرت مصعب بن عمیرؓ اور بے شمار دوسرے جاں نثاران محمد ﷺ اور نبوت میں شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے ہیں۔ سوگ کا دن منایا جاتا تو ان کا منایا جاتا۔ لیکن رنج و غم کی بات کون سی ہے!! اسلام کی تاریخ کا کون سا دور ہے جو ان شہادتوں اور قربانیوں سے خالی ہو؟ اسلام کے گلشن میں ہر چہار طرف یہ پھول کھلے ہوئے ہیں۔

پھر غور فرمائیے کہ اسلامی تقویم کا جو پہلا دن ہر سال آتا ہے، یعنی یکم محرم الحرام تو

یہ ایک عظیم شہادت کا دن ہے، یعنی دوسرے خلیفہ راشد امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق ؓ کی شہادت کا دن یکم محرم الحرام ہے۔ وہ عمر بن کے متعلق آنحضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ”اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔“ اگر رنج و غم کے اظہار کا مسئلہ ہوتا اور اگر سوگ کا دن منانے کا معاملہ ہوتا تو آج کے دن یعنی یکم محرم الحرام ہوتا۔ حضرت عمر ؓ پر قاتلانہ حملہ ۲۸ رزی الحجہ کو ہوا تھا جس میں آنجناب مجروح ہوئے تھے اور معتبر روایات کے مطابق ان کی وفات یکم محرم الحرام کو ہوئی تھی۔ پھر ۱۸ رزی الحجہ کو تیسرے خلیفہ راشد ذوالنورین حضرت عثمان غنی ؓ تقریباً پچاس دن کے محاصرے کے بعد انتہائی مظلومانہ طور پر شہید کئے گئے جن کی شہادت کے نتیجے میں مسلمان آپس میں دست و گریباں ہوئے اور امت میں ایسا تفرقہ پڑا کہ آج تک ختم نہیں ہوا۔ سوگ کا دن منانا ہوتا تو اس ”شہید مظلوم“ کی شہادت کے دن کو منایا جاتا۔ پھر ۲۱ رمضان المبارک کو اسد اللہ حضرت علی ؓ حضور ﷺ کے چچیرے بھائی، آپ کے داماد جو تھے خلیفہ راشد شہید کر دیئے گئے جو حضرات حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے والد ماجد بھی ہیں۔ سوگ کا دن منانا ہوتا تو ایک مخصوص مکتب فکر کے افراد کے بجائے پوری امت آنجناب کی شہادت کے دن سوگ مناتی۔ اگر سوگ کے دن منانے کا سلسلہ جاری رہے تو بتائیے کون کون سے دن سوگ منایا جائے گا؟ سال کا کون سا دن ہوگا جو کسی نہ کسی عظیم شخصیت اور اولیاء اللہ کی شہادت یا وفات کا دن نہ ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دین میں سوگ اور ماتم اور ان کے دن منانے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ جس گھر میں کسی کی وفات ہوئی ہو تو سوگ کی کیفیت کی زیادہ سے زیادہ تین دن کے لئے اجازت ہے۔ اس میں بھی نوحہ، گریہ اور سینہ کو بی کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ باقی رہا یہ کہ ان میں سے جنہوں نے بھی اللہ کی راہ میں قربانیاں دی ہیں اور حق و صداقت کے لئے اپنی جانیں دی ہیں، اس کی بنیاد پر ان کا بہت ارفع و اعلیٰ مقام ہے۔ لیکن نہ تو دن اور یادگار منانا ہمارے دین کے مطابق ہے نہ ہی یہ کوئی رنج و غم اور الم و حزن کا معاملہ ہے اور نہ ہر سال سوگ اور ماتم کرنا دین سے کوئی مناسبت رکھتا ہے۔

شاید آپ کو معلوم ہو کہ ہمارے یہاں صوفیاء کے نزدیک موت کو ایک محبوب اور محبت کی ملاقات کا وقت تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ جو لفظ ”عرس“ رائج ہے تو اس کے معنی شادی کے ہیں۔ جیسے عرس (شادی) ایک خوشی کا موقع ہوتا ہے ویسے ہی موت کسی مرد مؤمن کے لئے کسی رنج و غم کا موقع ہے ہی نہیں، چاہے وہ طبعی ہو چاہے قتل کی صورت میں ہو۔ یہ تو درحقیقت ایک محبوب اور محبت کی ملاقات ہے۔ اس پہلو سے علامہ اقبال کا وہ شعر ذہن میں رکھئے کہ۔

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم

چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست!

تو تبسمِ خوشی کے موقع پر ہوتا ہے نہ کہ غمی کے موقع پر۔ پس یہ سوگ اور ماتم کے دن منانا قطعاً ہمارے دین کے ساتھ مناسبت رکھنے والی چیز نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارے معاشرے میں یہ غلط رواج چلا آ رہا ہے کہ محرم الحرام، بالخصوص اس کے پہلے عشرے میں شادیاں نہیں ہوتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذی الحجہ کے آخری عشرے میں شادیوں کا ایک طوفان آ جاتا ہے۔ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہو گا کہ امسال ذی الحجہ کے آخری دنوں میں لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں روزانہ ہزاروں کی تعداد میں شادیاں انجام پائی ہیں۔ آخر ہم نے محرم الحرام، بالخصوص اس کے پہلے عشرے، کو شادی بیاہ کی تقریب کے لئے حرام یا منہوس کیوں سمجھ لیا ہے!!

ساختہ کر بلا

ڈاکٹر اسرار احمد
کی ایک تقریر

جو موصوف نے محرم الحرام ۱۴۰۲ھ
کو قبل از نماز جمعہ
جامع مسجد دار السلام باغ جناح لاہور
میں ارشاد فرمائی

سانحہ کربلا

نَعْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ..... بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
 ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۱۰۰﴾
 وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنَّ لَّا
 تَشْعُرُونَ ﴿۱۰۱﴾ وَنَبِّئُوكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصِ مِنَ الْأَمْوَالِ
 وَالْأَنْفُسِ وَالنَّمَرَاتِ ۚ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ﴿۱۰۲﴾ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ
 قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ ﴿۱۰۳﴾ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ
 وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْتَخِرُونَ ﴿۱۰۴﴾ (البقرة: ۱۰۳ تا ۱۰۷)..... ﷺ

ان آیات کی تلاوت اور ادعیٰ مسنونہ کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے فرمایا:
 ”حضرات! دو دن بعد محرم الحرام ۱۴۰۲ھ کی دس تاریخ ہوگی جو ’یوم عاشوراء‘
 کہلاتا ہے۔ یقیناً یہ بات آپ کے علم میں ہوگی کہ ۱۰ محرم الحرام سن ۶۱ ہجری کو ایک نہایت
 افسوس ناک حادثہ دشتِ کربلا میں پیش آیا تھا، جس میں سبطِ رسول سیدنا حضرت حسین
 ابن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور آپ کے خاندان کے اکثر افراد نیز آپ کے اعموان و
 انصار کی کثیر تعداد نے جامِ شہادت نوش فرمایا تھا۔ اس حادثہ کے متعلق یہ بات اچھی
 طرح سمجھ لی جانی چاہئے کہ یہ اچانک ظہور پذیر ہونے والا حادثہ نہیں تھا بلکہ درحقیقت
 اسی سبائی سازش کا ایک مظہر تھا جو پورے پچیس سال قبل اس سے بھی کہیں زیادہ افسوس
 ناک حادثے کو جنم دے چکی تھی، یعنی نبی اکرم ﷺ کے دوہرے داماد اور تیسرے خلیفہ
 راشد حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت۔ حضرت عثمان کی شہادت کا
 سانحہ ۱۸ ارزی الحجہ ۳۶ھ کو پیش آیا تھا اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۱ء (۱۷ ارزی الحجہ ۱۴۰۱ھ)

کے جمعہ کے اجتماع میں، میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سیرت اور ان کی شہادت کے تاریخی پس منظر پر کچھ گفتگو کی تھی ^(۱) جس پر زیادہ دن نہیں گزرے۔ لہذا مجھے آج سہولت محسوس ہو رہی ہے کہ واقعہ کربلا کے بیان کے ضمن میں، میں اپنی گفتگو کا تسلسل اسی کے ساتھ جوڑ سکتا ہوں۔

اولاً ذہن میں یہ بات تازہ کر لیجئے کہ حق و باطل کی جو کشمکش ازل سے چلی آ رہی ہے، بقول علامہ اقبال۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
جراغِ مصطفویٰ سے شرابِ بولہبی

اس کے ضمن میں ہمیں تاریخ کا کچھ ایسا نقشہ نظر آتا ہے کہ زیادہ تر غلبہ باطل کا رہا۔ حق کے غلبے کے ادوار بڑے مختصر رہے۔ یہ بھی ایک حقیقت کبریٰ ہے کہ جب کبھی حق کا غلبہ ہوا ہے تو باطل نے اسے اپنی آخری شکست تسلیم نہیں کیا بلکہ ایسے مواقع پر وہ وقتی طور پر دبک جاتا رہا ہے۔ اس نے منافقانہ طور پر حق کا لبادہ اوڑھ لیا یا وہ وقتی طور پر زیر زمین چلا گیا۔ چنانچہ وہ اندری اندر اپنی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ جاری رکھتا ہے اور ایسے مواقع کی تاک میں رہتا ہے جب وہ حامیانِ حق کے درمیان کوئی شدید اختلاف و انتشار پیدا کر کے اپنے لئے راستہ بنا سکے اور حق کے خلاف کھڑا ہو سکے۔

چنانچہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ کا عظیم ترین معجزہ دنیا کو دکھا دیا یعنی ﴿جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ﴾ کا نقشہ بالفعل قائلہ انسانیت کو جسمِ سر سے دیکھنے کا موقع فراہم فرما دیا اور ایک وسیع و عریض خطہ زمین پر حق کو بالفعل قائم و نافذ فرما کر رہتی دنیا تک کے لئے ایک کامل نمونہ پیش فرما دیا تو حق غالب اور باطل سرخوں ہو گیا۔ لیکن باطل نے انقلابِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے آخری مرحلے میں وہی روش اختیار کی کہ وقتی طور پر شکست تسلیم کر کے وہ اس انتظار میں رہا کہ موقع آئے تو میں وار کروں اور

(۱) اس خاص موضوع پر ڈاکٹر صاحب موصوف کا پُر تاثر خطاب ”شہیدِ مظلوم“ کے نام سے مطبوعہ

کاری دار کروں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے انتقال کے فوراً بعد فتنوں کا ہجوم اٹھ کھڑا ہوا۔ کئی کاذب مدعیان نبوت میدان میں آگئے اور ان کے ساتھ کافی جمعیت ہو گئی۔ پھر مانعین و منکرین زکوٰۃ سے سابقہ پیش آیا اور اہل ایمان کو بیک وقت ایسے ایسے عظیم فتنوں سے نہر د آزما ہونا پڑا کہ وقتی طور پر تو محسوس ہوتا تھا کہ حق کا چراغ اب بجھا کہ بجھا! یہ درحقیقت وہ انقلاب دشمن قوتیں (Counter-Revolutionary Forces) تھیں جن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے واقفان صدیق ہی نہیں بلکہ صدیق اکبر کی شخصیت درکار تھی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ و اضاہ۔ صدیق دراصل نبی کا عکس کامل ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے ثابت کر دیا کہ جس انقلاب کی تکمیل نبی اکرم ﷺ نے بنفس نفیس فرمائی تھی اس کے خلاف آپ کی وفات کے بعد جو ردعمل ظاہر ہوا، اس کی سرکوبی کرنے کی پوری صلاحیت اور عزیمت اور آہنی قوت ارادی ان کے نحیف و نزار جسم میں موجود تھی۔ حضرت ابو بکر ؓ نے نبی اکرم ﷺ کے انقلاب کو مستحکم (Consolidate) کیا اور زمام کار حضرت عمر فاروق ؓ کے حوالے کر کے وہ بھی اپنے مالک حقیقی کی طرف مراجعت فرما گئے۔

حضرت عمر فاروق ؓ کا دور خلافت اور جیسا کہ میں حضرت عثمان ؓ کی شہادت والی تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت ذوالنورینؓ کے بارہ سالہ دور خلافت میں سے بھی کم و بیش دس سال بالکل دور فاروقی ہی کی شان کے حامل تھے لہذا ان کو بھی شامل کر لیجئے تو یہ بیس سال اسلام کے استحکام اور اس کی توسیع کے سال ہیں۔ انقلاب محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے زیر نگیں عراق و شام و فارس (ایران) کے پورے کے پورے ملک اور شمالی افریقہ کا مصر سے مراکش تک کا وسیع علاقہ آ گیا اور اس پر اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا اور اللہ کا دین غالب و نافذ ہو گیا۔ اب ظاہر بات ہے کہ اس کے خلاف بھی ایک ردعمل ہونا تھا۔ یہ جو Historical Process ہے اس کے کچھ غیر متبادل اصول ہیں۔ آپ کے علم میں ہے کہ جس انقلاب کی تکمیل اندرون عرب نبی اکرم ﷺ نے بنفس نفیس فرمائی، اس کے ردعمل میں مخالفانہ تحریکیں

(Reactionary Movements) اٹھ کھڑی ہوئیں تو توسیع کا جو مرحلہ آپ کے جاں نثاروں کے ہاتھوں انجام پایا، اس کا رد عمل کیوں نہ ہوتا! چنانچہ باطل نے پہلا وار کیا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ذات پر۔ باطل پرست یہ سمجھتے تھے کہ شاید یہ پوری عمارت اسی ایک ستون پر کھڑی ہے، اس کو گرا دو تو عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ الحمد للہ کہ ان کی توقع غلط ثابت ہوئی اور عمارت برقرار رہی۔ یہ خالص ایرانی سازش تھی۔ ابولو لوفیر وز پارسی ایرانی غلام اور اس کی پشت پر ہر مزان ایک ایرانی جرنیل تھا۔

اس سازش کی ناکامی کے بعد جو دوسرا دار ہوا، وہ بہت کاری دار تھا۔ اس میں یہود کی عیاری اور کیادی شامل تھی۔ ان کا سازشی ذہن اور اس میں مہارت ضرب المثل بن چکی ہے۔ عبد اللہ بن سباء یمن کا ایک یہودی اٹھتا ہے، اسلام کا لبادہ اوڑھتا ہے، مدینہ منورہ میں آ کر قیام کرتا ہے اور نئے نئے شکوے چھوڑنے شروع کر دیتا ہے۔ کہیں محبت آل رسول کے پردے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے متعلق وسوسہ اندازی کرتا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے استحقاق خلافت کا پروپیگنڈا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے اور وہی خلافت کا حق دار ہوتا ہے تو اصل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں لہذا خلافت کے حق دار وہ ہیں۔ ان کی بجائے جو بھی مسند خلافت پر فائز ہوا یا اب ہے، وہ غاصب ہے۔ کہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کے عقیدے کا پرچار کرتا ہے جس سے اسلام کی جڑ ”توحید“ پر کاری ضرب لگتی ہے۔ ایرانی نو مسلم جن کی گھٹی میں نسلًا بعد نسل شاہ پرستی اور Hero Worship پڑی ہوئی تھی اور جو نسب کی بنیاد پر اقتدار کی منتہی کے خوگر تھے ان پر اس کا کتنا گہرا اثر ہوا ہوگا! — کہیں بظاہر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بیان کرنے کے لئے یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ جب حضرت مسیح صلی اللہ علیہ وسلم کا نزول ثانی ہوا تو ہمارے رسول جو افضل الانبیاء ہیں، وہ بھی دوبارہ واپس تشریف لائیں گے — اب دیکھئے کہ غیر عرب نو مسلم خوش عقیدہ لوگوں کے دلوں کو یہ بات کتنی بھانے والی ہے کہ اس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا بیان ہو رہا ہے۔ یہی حربہ ہے جو اس دور میں قادیانیوں نے استعمال کیا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے اور ان کے نزول کے عقیدے کی نفی کرنے کے لئے انہوں نے اسی دلیل کا رخ اس طرف رکھا کہ اس طرح تو ہمارے رسول کی عظمت مجروح ہوگی یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارے نبی تو فوت ہو گئے ہوں اور حضرت مسیح علیہ السلام آسمان پر زندہ موجود ہوں اور دوبارہ تشریف لائیں: گویا اصل بات یہی ہے کہ عوام الناس کی اکثریت عقیدت کی بنیاد پر اس قسم کے مغالطوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ان باتوں نے سادہ لوح لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں گھر کرنا شروع کر دیا۔ یہ شخص مدینہ سے بصرہ گیا، وہاں بھی اس نے اپنا ایک مرکز قائم کیا۔ پھر کوفہ گیا، وہاں اس نے اپنا ایک مرکز قائم کیا۔ دمشق جا کر وہاں کوشش کی لیکن وہاں دال نہ گلی۔ پھر مصر گیا، وہاں اپنے ہم خیالوں کی ایک جماعت پیدا کی۔ یوں ہر طرف اس نے ایک فتنہ و فساد کی فضا پیدا کر دی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے آخری دو سال اس فتنہ و فساد کی نذر ہو گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امام مظلوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی جو تاریخ انسانی کی عظیم ترین مظلومانہ شہادت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ اس وقت عظیم ترین مملکت کے فرماں روا تھے، لاکھوں کی تعداد میں فوجیں موجود تھیں جو ان کے اشارے پر کٹ مرنے کے لئے تیار تھیں، جب مٹھی بھر باغیوں نے اس شہید مظلوم کا محاصرہ کر رکھا تھا تو مختلف صوبوں کے گورنروں کی طرف سے استدعا آ رہی تھی کہ ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم فوجیں لے کر حاضر ہو جائیں اور ان باغیوں کی سرکوبی کریں، لیکن وہ امام وقت یہ عزم کئے ہوئے تھے کہ میں اپنی جان کی حفاظت و مدافعت میں کسی کلمہ گو کا خون بہانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اتنی عظیم قوت و سطوت کا حامل اور اس طرح اپنی جان دینے کے لئے آمادہ ہو جائے اور اپنی جان کی حفاظت و مدافعت میں کسی کا خون بہانے کے لئے تیار نہ ہو، واقعہ یہ ہے کہ پوری تاریخ انسانی میں اس کی کوئی مثال ممکن نہیں ہے۔ یہ بات بھی جان لیجئے کہ ہمارے ہاں شاعری میں بے پناہ مشرکانہ ادہام موجود ہیں۔ غلط فکر اور عقیدوں کی ترویج میں شاعری نے بہت حصہ لیا ہے۔ ایسے اشعار زبان زد عوام و خاص ہو جاتے ہیں جن میں غلو بھی ہوتا ہے اور غلط فکر بھی۔ شعراء

کے متعلق قرآن حکیم نے یہ دو ٹوک بات فرمادی ہے کہ:

﴿وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ۗ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ لَمَّا قَامُوا وَإِيَّاهُمْ يَوْمُنَا ۗ﴾

”اور شعراء کی بات تو یہ ہے کہ ان کے پیچھے تو نیبکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں۔“

مخاطب ترین لوگ بھی جب شاعری کی ترنگ میں آتے ہیں تو ان کی زبان و قلم سے بھی غیر مخاطب اور غلط باتیں نکل جاتی ہیں۔ مثلاً آپ علامہ اقبال کے اس شعر پر غور کیجئے۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم

نہایت اس کی حسین ابتداء ہے اسمعیلؑ

غور طلب بات یہ ہے کہ شہادت حسینؑ اور ذبح اسمعیلؑ میں کون سی چیز مشترک

ہے! حضرت اسمعیلؑ کو ذبح کرنے کے لئے آمادہ کون ہوئے؟ اللہ کے ایک جلیل

القدر بیغمبر! کیا حضرت حسینؑ کی شہادت بھی کسی ایسے ہی ایک جلیل القدر شخص کے

ہاتھوں ہوئی ہے؟ معاذ اللہ! ثم معاذ اللہ! ثم معاذ اللہ۔ کون سی قدر مشترک ہے؟ حضرت

اسمعیلؑ نے تو ذبح ہونے کے لئے خود ہی اپنی گردن پیش کی تھی لہذا آیت قرآنی:

﴿فَلَمَّا أَسْلَمَا﴾ ”پس جب ان دونوں (باپ بیٹوں) نے سر تسلیم خم کر دیا“

باپ اور بیٹے دونوں نے فرماں برداری کا بے مثال اور تاریخ ساز مظاہرہ پیش کیا لہذا

اس آیت میں مثنیہ کا صیغہ اَسْلَمَا آیا ہے۔ حضرت حسینؑ نے دادِ شجاعت دیتے

ہوئے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ اور وہ ”فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ“ (سورہ توبہ) ”تو وہ قتل

کرتے بھی ہیں اور (کبھی) قتل ہو بھی جاتے ہیں“ کے مصداقِ کامل بنے تھے۔ تو وہ

کون سی بات ہے جو ان دونوں واقعات کے مابین کسی پہلو سے مشترک قدر قرار دی جا

سکتی ہے! پھر وہاں تو ارادہ ذبح تھا، لیکن ذبح بالفعل ہوا نہیں۔ یہاں حضرت حسینؑ

بالفعل شہید کئے گئے ہیں۔ لہذا ان واقعات میں آپ کو کوئی قدر مشترک نہیں ملے گی۔

ہاں ایک واقعاتی اشتراک پیدا ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم بقید حیات ہوتے تو ان

کی خدمت میں عرض کرتا کہ اس شعر کے دوسرے مصرعے کو تبدیل کر کے یوں کر دیا

جائے تو واقعی اقدار کا اشتراک پیدا ہو جائے گا کہ

غریب و سادہ و رُغلیں ہے داستانِ حرم

نہایت اس کی ہیں عثمانؓ ابتدا ہائیل

حضرت ہائیل کا قتل ہوا ہے اور اس شان کے ساتھ ہوا ہے کہ بھائی قتل پر ٹٹلا ہوا

ہے اس کی آنکھوں میں خون اتر ا ہوا ہے لیکن وہ اللہ کا بندہ اپنی مدافعت میں ہاتھ

اٹھانے کے لئے تیار نہیں۔ انہوں نے اپنے بھائی قاتیل سے کہا:

﴿لَئِنْ بَسَطْتُ إِلَيْكَ يَدِي لِغَتْلُنِي مَا أَنَا بِبَاطِلٍ يُدِي إِلَيْكَ لِأَتُفْلِكَ﴾ (المائدہ: ۲۸)

”اگر تم مجھے قتل کرنے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھاؤ گے تب بھی میں اپنا ہاتھ نہیں

اٹھاؤں گا تم کو قتل کرنے کے لئے۔“

اور ہائیل قتل ہو گئے۔ بھائی نے بھائی کو قتل کر دیا۔ یہ وہ واقعہ ہے جس کا کلام اللہ میں

سورۃ المائدۃ میں بڑے اہتمام اور بڑی شان کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے

جس پر ہمیں وہ آیت مبارکہ ملتی ہے کہ ”اسی لئے ہم نے یہ لکھ دیا ہے کہ جس شخص نے بھی

کسی ایک انسانی جان کو ناحق اور بغیر سبب قتل کیا تو اس نے گویا پوری نوع انسانی کو قتل کر

دیا اور جس نے ایک بھی جان بچائی اس نے گویا پوری نوع انسانی کی جان بچائی۔“

﴿لَمَّا قُتِلَ النَّاسُ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَانَتْ أَحْيَا النَّاسِ جَمِيعًا﴾ (المائدہ: ۳۲)

یہ واقعہ حضرت ہائیل کا ہے۔ اس کی کامل مناسبت اور مشابہت حضرت عثمانؓ کی

شہادت میں ہے۔ ہاتھ اٹھانے کو تیار نہیں ہوئے۔ طاقت ہے، قوت ہے، سب کچھ

ہے۔ حضرت طلحہؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ، حضرت علیؓ، محاصرین کی سرکوبی کی

اجازت طلب کر رہے ہیں۔ انصار آ رہے ہیں کہ ہمیں اجازت دیجئے، ہم دوسری مرتبہ

اللہ کے انصار بننا چاہتے ہیں۔ پہلے ہم نے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی جاں نثاری

میں اللہ کے مددگار ہونے کا خطاب حاصل کیا، آج ہم خلیفۃ الرسول کی مدد کرنے کے

خواستگار ہیں۔ ہمیں موقع دیجئے کہ ہمارے اس خطاب کی پھر تجدید ہو جائے۔ مختلف

صوبوں کے گورنروں کے جو پیغامات آ رہے تھے کہ ہمیں فوجیں لے کر آنے کی

اجازت دیجئے، اس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جو صبر و ثبات کے کوہ ہمالیہ ثابت ہوئے، جواب یہی تھا کہ نہیں، میں اپنی مدافعت میں کسی کلمہ کو کا خون بہانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، دروازے پر پہرے دار تھے لیکن باغی پیچھے سے دیوار پھانڈ کر گئے اور اس ہستی کو شہید کر دیا جس کو ذوالنورین کا لقب حاصل تھا اور جس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم راضی تھے اور جس کے حق میں دعا فرمایا کرتے تھے کہ ”اے اللہ! میں عثمانؓ سے راضی ہوں، تو بھی اس سے راضی رہو۔“ حضرت عبداللہ بن سلام جو اسلام قبول کرنے سے پہلے ایک جید یہودی عالم تھے، وہ آتے ہیں اور باغیوں کو مخاطب کرتے ہیں کہ لوگو! باز آ جاؤ، میں تورات کا عالم ہوں اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اللہ کے کسی نبی کو قتل کیا گیا ہو اور اس کے بعد کم سے کم ستر ہزار انسان قتل نہ ہوئے ہوں یا کبھی کسی نبی کے خلیفہ کو قتل کیا گیا ہو اور اس کے بعد کم از کم پینتیس ہزار انسانوں کو قتل نہ کیا گیا ہو۔ جان لیجئے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو فتنے کی آگ بھڑکی، اس میں چوراسی ہزار مسلمان قتل ہوئے۔

حضرت علیؓ کے عہد خلافت کے پورے پونے پانچ برس باہم خانہ جنگی میں گزرے۔ جنگ جمل ہے اور جنگ صفین ہے۔ جنگ نہروان ہے۔ مسلمان کے ہاتھ میں مسلمان کا گریبان ہے اور مسلمان کی تلوار مسلمان ہی کا خون چاٹ رہی ہے۔ مسلمان کا نیزہ ہے جو مسلمان کے سینے کے پار ہو رہا ہے۔ اور کیسے کیسے لوگ! حضرت طلحہؓ شہید ہو رہے ہیں، حضرت زبیرؓ شہید ہو رہے ہیں، حضرت عمار بن یاسرؓ شہید ہو رہے ہیں۔ پھر یہ کہ حضرت علیؓ شہید ہو رہے ہیں۔ حضرت امیر معاویہؓ پر حملہ ہوا لیکن ان پر وار کاری نہ پڑا اور وہ بچ گئے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ پر حملہ ہوا، لیکن وہ اس روز کسی وجہ سے نماز فجر کے لئے نہ آئے تھے، اس لئے ان کے مقابلے میں ان کے قائم مقام شہید ہوئے۔ پھر نہ جانے ان کے علاوہ کیسے کیسے مخلص اور شجاع مسلمان ان جنگوں میں کھیت رہے۔

اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ اس سارے فتنے کی آگ بھڑکانے والے عبداللہ بن سبا کے حواری تھے اور یہ وہ آگ تھی جو پھر ٹھنڈی نہ ہو سکی۔ اس سبائی سازش کو سمجھنے کے لئے میں جنگ جمل کا ایک چھوٹا سا واقعہ پیش کرتا ہوں جو تمام مستند تاریخوں میں موجود ہے۔ یہ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فوج کے ساتھ نکلی ہیں اور بصرہ پر ان کا قبضہ ہوا۔ حضرت عائشہؓ خلافت کی مدعی نہیں تھی، معاذ اللہ۔ ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ خون عثمانؓ کا قصاص لیا جائے۔ اس وقت دونوں لشکر آمنے سامنے تھے اور حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ جنگ کے بجائے گفت و شنید سے قضیہ نمٹانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ حضرت علیؓ کی طرف سے یہ بات سامنے آئی کہ وہ خون عثمانؓ کا قصاص لینے کے لئے بالکل تیار ہیں، لیکن پہلے ان کے ہاتھ تو مضبوط کئے جائیں۔ اگر ان کے ہاتھ پر بیعت ہو جائے اور انہیں تقویت پہنچائی جائے تو وہ فتنہ پردازوں سے پورا پورا حساب لیں گے۔ لہذا بات چیت شروع ہوئی۔ ایک بڑی امید افزا نظر آنے لگی کہ حالات درست ہو جائیں گے۔ لیکن عین اس وقت عبداللہ بن سبا اور مالک بن اشتر نجفی رات کی تاریکی میں سازش کرتے ہیں کہ اس طرح تو ہمارا بھانڈا پھولے گا، ہماری سازش کا پردہ چاک ہو گا، یہ جو ڈرامہ کھیلنے کے لئے ہم نے سٹیج بچھائی ہے، یہ تو برباد ہو جائے گی۔ لہذا وہ رات کی تاریکی میں کچھ لوگوں کو لے کر حضرت عائشہؓ کے کیمپ پر حملہ کر دیتے ہیں۔ ادھر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کی فوجوں نے حملہ کر دیا ہے۔ ادھر وہ حضرت علیؓ کے کیمپ میں یہ پیغام بھیجتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے لشکر نے حملہ کی ابتدا کی ہے اور وہ اچانک ہم پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ چنانچہ دونوں لشکر ایک دوسرے سے پوری طرح بھڑ گئے۔ آپ اس بات کو پیش نظر رکھئے کہ جب جنگ چھڑ جاتی ہے تو تحقیق کا کوئی وقت نہیں ہوتا اور یہ قطعاً ممکن نہیں ہوتا کہ عین اس وقت تفتیش ہو کہ اصل معاملہ کیا ہے! کس نے ابتدا کی تھی اور اس کا اصل محرک کیا ہے؟ یہ تو وہ وقت ہوتا ہے کہ لوگ اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھے برس رہا رہتے ہیں۔ پھر جو خون ریزی ہوئی ہے اور سو ڈوسو نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ایک دوسرے کی تلوار سے شہید ہوئے

ہیں یہ ہماری تاریخ کا ایک دردناک باب ہے۔ اس سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ واقعتاً فتنے کی آگ کو بھڑکانے والا چھوٹا سا گروہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو اس کو اس طرح بھڑکا دے کہ پھر اسے بجھایا نہ جاسکے۔ یہی معاملہ جنگ صفین کے موقع پر ہوا ہے۔ وہاں بھی مصالجانہ گفتگو کی فضا پیدا ہو گئی تھی، لیکن سبائی سازشی گروہ نے اسے بھی ناکام بنا دیا اور فتنہ ختم نہیں ہوا بلکہ اس میں ”خوارج“ کے گروہ کا اضافہ ہو گیا اور ایک نیا محاذ کھل گیا۔

آگے چلئے! وقت کی قلت کی وجہ سے مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے، اختصار کے ساتھ کرنا ہے۔ حضرت علی ؓ کی ایک خارجی کے ہاتھوں شہادت ہوتی ہے۔ اس موقع پر یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ حضرت علی ؓ کے عہد خلافت میں عالم اسلام ایک وحدت کی صورت میں باقی نہیں رہا تھا۔ امیر معاویہ ؓ شام کے گورنر کی حیثیت سے اس بات کے مدعی تھے کہ خون عثمان ؓ کا قصاص لیا جانا چاہئے۔ یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ حضرت معاویہ ؓ نے قطعاً خلافت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ وہ ہرگز مدعی خلافت نہ تھے نہ حضرت علی ؓ کی خلافت کے منکر۔ وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ حضرت علی ؓ خلافت کے حق دار نہیں، معاذ اللہ۔ اور یہ کہ ان کے بدلے مجھے خلافت ملنی چاہئے، ہرگز نہیں۔ وہ صرف خون عثمان ؓ کے قصاص کے مدعی تھے۔ ان کی ایک وسیع رقبے پر بحیثیت گورنر حکومت رہی ہے اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ قاتلان عثمان ؓ کو جو حضرت علی ؓ کے کیمپ میں شامل اور معاملات میں پیش پیش تھے، سزا دی جائے۔ اس کے بعد وہ بیعت کر لیں گے۔ ان کا موقف صحیح تھا یا غلط اس پر گفتگو کا یہ موقع و محل نہیں ہے۔ فی الوقت پیش نظر صرف اس صورتِ واقعی کا بیان ہے کہ اس وقت عالم اسلام ایک وحدت کی حیثیت سے موجود نہیں تھا۔

حضرت علی ؓ کی شہادت کے بعد کوفہ میں حضرت حسن ؓ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت ہوئی۔ اب معلوم ہوا کہ نئے سرے سے تصادم کی نوبت آنے والی ہے۔ ادھر حضرت حسن ؓ کوفہ سے چالیس ہزار فوج لے کر چلے ہیں، ادھر حضرت معاویہ ؓ دمشق

سے ایک بڑی فوج لے کر روانہ ہوتے ہیں۔ مدائن کے آس پاس دونوں لشکروں کی
 مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ حضرت حسن ؓ کی فوج کا ہراول دستہ آگے آگے جا رہا تھا۔ اس
 کے متعلق یہ افواہ اڑ گئی کہ اس کو شکست ہو گئی۔ یہ افواہ کس نے اڑائی..... واللہ اعلم۔
 نتیجہ یہ نکلا کہ وہی کوئی جو حضرت حسنؓ کے ساتھ تھے انہوں نے وہاں وہ طوفان بدتمیزی
 برپا کیا کہ بیان سے باہر ہے۔ بغاوت کر دی، خیمے لوٹ لئے، جناب حسن ؓ پر دست
 درازئی کی آغوش کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ ان باغی کو فیوں کے ہاتھوں اپنی جان کا
 خطرہ دیکھ کر آغوش کو کسریٰ کے محل میں پناہ لینی پڑی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت
 حسن ؓ کو ان کو فیوں کے مزاج کا بخوبی تجربہ ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے مصالحت دین
 کی خاطر وہیں سے حضرت معاویہؓ کو مصالحت کی پیش کش ارسال کر دی جسے حضرت
 معاویہؓ نے فوراً قبول کر لیا اور اپنی طرف سے ایک سادہ سفید کاغذ پر اپنی مہر لگا کر
 حضرت حسنؓ کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیج دیا کہ جو شرطیں آپ چاہیں لکھ دیں، مجھے
 منظور ہوں گی۔ اس کو ہم Blank Cheque سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ مصالحت
 ہو گئی۔ مصالحت نامہ میں ایک شرط یہ تھی کہ ایران کے صوبے اہواز کا خراج حضرت حسنؓ کو
 ملے گا۔ یہ ایران کا وہی صوبہ ہے جس کا آج کل اخبارات میں ایران و عراق کی جنگ کے
 سلسلے میں کافی ذکر ہو رہا ہے اور جہاں عرب کافی تعداد میں آباد ہیں۔ ایک دوسری شرط یہ
 تھی کہ بیس لاکھ درہم سالانہ میرے چھوٹے بھائی حضرت حسینؓ کو ملیں گے۔ ایک اور شرط یہ
 بھی تھی کہ وظائف کی تقسیم کے معاملے میں بنی ہاشم کے حق کو دوسروں کے مقابلے میں
 زیادہ تسلیم کیا جائے گا۔ ایک شرط یہ بھی تھی کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے اس پر کسی سے باز
 پرس نہیں ہوگی۔ گویا کہ یہ عام معافی (General Amnesty) کا اعلان
 تھا۔ حضرت معاویہؓ نے تمام شرائط منظور کر لیں اور الحمد للہ تقریباً پانچ سال کے
 اختلاف، افتراق، انتشار اور باہمی خانہ جنگی کا دروازہ بند ہوا۔ اب پورا عالم اسلام ایک
 وحدت بن گیا۔ واضح رہے کہ اس کے بعد حضرت معاویہؓ نے بیعتِ خلافت لی۔ اس صلح
 کے واقعہ پر حضرت حسنؓ نے ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا کہ ”اگر خلافت ان کا یعنی حضرت

معاویہؓ کا حق تھی تو ان تک پہنچ گئی اور اگر میرا حق تھی تو میں نے بھی ان کو سونپ دی۔ جھگڑا ختم ہوا۔“ یہ وہ بات تھی جس کی پیشین گوئی آنحضرت ﷺ نے فرمائی تھی کہ میرے اس بیٹے یعنی حضرت حسنؓ کے ذریعے اللہ تعالیٰ ایک وقت میں مسلمانوں کے دو گروہوں میں مصالحت کرائے گا۔ یہ خصوصی مقام اور رتبہ ہے جناب حسن ﷺ کا..... ع

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا! لیکن ذہن میں رکھئے کہ وہ سازشی سبائی اس صورت حال سے سخت مشتعل تھے۔ انہوں نے حضرت حسن ﷺ پر طعن کیا، آپ کی طرح طرح سے توہین کی، آپ کو ”یاعا ر المؤمنین“ یعنی ”اے اہل ایمان کے حق میں عار اور ننگ اور شرم کے باعث انسان“ اور ”یا مذل المؤمنین“ یعنی ”اے مسلمانوں کو ذلیل کرنے والے انسان“ کہا گیا۔ یہ توہین آمیز خطابات وہ لوگ آپ کو دیتے تھے جو بظاہر آپ کے حامی تھے۔ وہ برملا کہتے تھے کہ اے حسنؓ تم نے یہ صلح کر کے ہماری ناک کنوا دی ہے اور ”اہل ایمان“ کے لئے تم نے کوئی عزت کا مقام باقی نہیں رکھا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس امت کی طرف سے ابد الابد تک حضرت حسن ﷺ کو جزاء خیر عطا فرمائے کہ ان کے اس ایثار کی بدولت وہ رخنہ بند ہو گیا اور وہ دراڑ پُر ہو گئی جو عالم اسلام میں اس آپس کے خلفشار کی وجہ سے پڑ گئی تھی۔

اب اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ پورے بیس برس تک عالم اسلام پھر متحد رہا۔ یہ بات میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ حضرت امیر معاویہؓ کے عہد حکومت کو اہل سنت دور خلافت راشدہ میں شامل نہیں کرتے۔ اسلامی حکومت کا آئیڈیل مزاج وہ ہے جو ہمیں حضرت ابو بکر صدیقؓ سے لے کر حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دس سال تک نظر آتا ہے۔ حضرت معاویہؓ صحابی اور کاتب وحی ہیں۔ کسی بد نیتی کو ہم ان کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے اور صحیح ہے کہ ان کا وہ مقام اور مرتبہ کبھی کسی نے نہیں سمجھا جو حضرت علیؓ کا ہے۔ میں نے پہلے

بھی کئی بار عرض کیا ہے اور اس کا آج پھر اعادہ کرتا ہوں کہ حضرت علی ؓ کے دور خلافت میں جو جھگڑے رہے اور مسلمانوں میں آپس میں جو جنگیں ہوئیں، حاشا وکلا ان کا کوئی الزام حضرت علی ؓ کی ذات پر نہیں ہے۔ اس میں ان کا نہ کوئی قصور تھا نہ کوتاہی..... معاذ اللہ۔ یہ تو اغیار کی سازش تھی کہ انہوں نے فتنہ کی آگ کو اس طرح بھڑکایا تھا کہ اس کو بجھایا نہ جاسکا۔ لیکن حضرت معاویہ ؓ کے عہد خلافت کے یہ بیس سال امن کے سال ہیں۔ باہمی خانہ جنگی ختم ہو گئی۔ ع ”ہوتا ہے جادہ پیا پھر کارواں ہمارا“ کی کیفیت پیدا ہوئی اور دعوت و تبلیغ اور جہاد و قتال کے عمل کا احیاء ہوا۔ توسیع از سر نو شروع ہوئی۔ فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا۔ یہ بیس سالہ دور خلافت راشدہ کے بعد اُمت کی تاریخ میں جتنے بھی ادوار آئے ہیں ان میں سب سے افضل اور بہتر دور ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ سربراہ حکومت ایک صحابی ہیں۔ ان کے بعد معاملہ آتا ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا لیکن وہ صحابی نہیں، تابعی ہیں۔ ع ”مگر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی“۔ ہم کسی غیر صحابی کو صحابی کے ہم پلہ اور ہم مرتبہ سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اہل سنت کا مجمع علیہ عقیدہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی بھی اُمت کے بڑے سے بڑے ولی سے افضل ہے۔

چنانچہ یہی بات ایک دوسرے انداز میں حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہی تھی۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ عمر بن عبدالعزیز افضل ہیں یا امیر معاویہ ؓ انہوں نے جواب دیا کہ ”معاویہ ؓ سے عمر بن عبدالعزیز ؓ کے افضل ہونے کا سوال کیا پیدا ہوگا۔ عمر بن عبدالعزیز ؓ سے تو وہ خاک بھی افضل ہے جو نبی اکرم ﷺ کی ہم رکابی میں اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے حضرت معاویہ ؓ کے گھوڑے کے تھنوں میں گئی ہے۔“ یہ فرق ہے صحابیت اور غیر صحابیت میں۔ بہر حال میں نے عرض کیا کہ امیر معاویہ ؓ کے دور حکومت کے بیس سال میں امن رہا۔ واضح رہے کہ حضرت حسین ؓ بھی وہی ہیں، حضرت حسن ؓ بھی دس سال تک زندہ رہے۔ سن ۴۱ھ میں یہ صلح ہوئی تھی اور سن ۵۱ھ میں حضرت حسن ؓ کا انتقال ہوا ہے۔ ان کا انتقال زہر کے اثر سے ہوا۔ زہر کس نے

دیا؟ کیوں دیا؟ اس کا تعلق حضرت معاویہؓ سے ہونا بعید از قیاس ہے۔ ان کو کیوں ضرورت پیش آئی تھی کہ وہ حضرت حسنؓ کو زہر دلواتے جبکہ صلح کے بعد ان دونوں کے قریبی اور دوستانہ مراسم تھے۔ زہر دینے والا کوئی کچھ میں آ سکتا ہے تو وہ بھی گروہ ہو سکتا ہے کہ جس نے آنجناب کو ”عار المؤمنین“ اور ”میل المؤمنین“ جیسے اہانت آمیز خطابات دیئے تھے اور آپ کو طرح طرح سے ذہنی اذیتیں پہنچائی تھیں۔ ظاہر ہے کہ زہر دلایا ہوگا تو اسی گروہ نے دلویا ہوگا۔ جن سے ان کی مصالحت ہے، ان کی طرف سے زہر دلانے کا امکان بہر حال عقل انسانی تسلیم نہیں کر سکتی۔

اس کے بعد آتا ہے امیر یزید کی بحیثیت ولی عہد ناحردگی اور پھر ان کے دور حکومت میں سانحہ کربلا کا واقعہ جو دردناک بھی ہے اور افسوس ناک بھی اور جس نے بلاشبک و شبہ تاریخ اسلام پر بہت ہی ناخوشگوار اثرات چھوڑے ہیں۔ اس مسئلہ پر گفتگو سے قبل میں چاہتا ہوں کہ آپ سے عرض کروں کہ اس موقع پر یہ بات ذہن میں رکھ لیجئے کہ اگرچہ امت میں اختلاف اور افتراق کے افسانے بہت ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے باقی اختلافات فقہی اختلافات ہیں، عقائد کے اختلافات نہیں ہیں۔۔۔ عقائد کے اختلافات تو ہمارے ہاں کے کچھ مخلی سطح کے نام نہاد و اعظین اور مولویوں نے بنا لئے ہیں کہ جن کی دوکان چلتی ہی ان اختلافات کے بل پر ہے۔۔۔ ورنہ ذہن میں رکھئے کہ دیوبندی ہوں، بریلوی ہوں ان کے عقائد ایک ہیں، عقائد کی مستند کتب ان کے ہاں ایک ہیں، ان کی فقہ بھی ایک ہے۔ پھر اہل سنت کے جو دوسرے گروہ ہیں، وہ مالکی ہوں، شافعی ہوں، حنبلی ہوں، اہلحدیث ہوں، ان میں فقہی معاملات میں اختلافات ہیں، عقائد ایک ہی ہیں۔ ہاں عقائد میں جو اختلاف واقع ہوا ہے تو وہ شیعوں اور سنیوں کے مابین ہوا ہے۔ اس اختلاف کو واقعتاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخی واقعات کے بارے میں رائے اور سیاسی اختلافات کو ایک طرف رکھا جا سکتا ہے۔ شخصیات کے بارے میں بھی اگر اختلاف ہو تو اسے بھی کسی حد تک نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ کسی کا ذاتی رجحان اگر یہ ہو کہ وہ حضرت علیؓ کو حضرت ابو بکرؓ سے افضل

میری ناقص رائے میں خلفائے راشدین کی فضیلت میں تقدیم و تاخیر اگرچہ فی
 نفس ایک اہم مسئلہ ہے تاہم اسے عقیدے کا اختلاف قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اصل اہم
 مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک معصومیت ختم ہو چکی ہے جناب محمد ﷺ پر۔ ہمارے
 نزدیک آنحضور ﷺ خاتم النبیین والمرسلین کے ساتھ ساتھ خاتم المعصومین بھی ہیں اور
 ہم اسے ایمان بالنبوت اور ایمان بالرسالت کا ایک لازمی جزو سمجھتے ہیں اور یہ بات
 یقیناً بنیادی عقیدے سے متعلق ہے۔ اس لئے کہ یہ عقیدہ ختم نبوت کا لازمی نتیجہ ہے۔
 چونکہ عصمت و معصومیت خاصہ نبوت ہے، نبوت ختم ہوئی تو عصمت و معصومیت بھی ختم
 ہوئی۔ اب نبوت کے بعد اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ وحی نبوت کا دروازہ بند ہے اور
 تاقیام قیامت بند رہے گا۔ تاریخ انسانی کا بقیہ سارا دور اجتہاد کا ہے۔ اجتہاد میں مجتہد
 اپنی امکانی حد تک کوشش کرتا ہے کہ اس کی رائے قرآن و سنت ہی سے ماخوذ و مستنبط
 ہو لیکن وہ معصوم عن الخطا نہیں ہے۔ اس اجتہاد میں خطا بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر نیک
 نیتی کے ساتھ خطا ہے تو ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ مجتہد قہری کو بھی اجر و ثواب ملے گا اگرچہ
 اکہرا اور مجتہد اگر مصیب ہو یعنی صحیح رائے تک پہنچ گیا ہو تو اسے دوہرا اجر ملے گا۔
 جبکہ شیعہ کتب فکر کا عقیدہ امامت معصومہ کا ہے۔ ہمارے نزدیک جیسا کہ میں نے ابھی
 عرض کیا، معصومیت خاصہ نبوت ہے۔ وہ اپنے ائمہ کو بھی معصوم مانتے ہیں اور یہ عقیدہ

رکھتے ہیں کہ ان سے خطا کا صدور ممکن نہیں۔ ہمارے اعتبار سے تو اس نوع کی امامت ایک قسم کی نبوت بن جاتی ہے اور ہر قسم کی نبوت کو ہم حضرت محمد ﷺ پر ختم سمجھتے ہیں۔ لہذا نبوت کے بعد جو بھی زمانہ آیا اس میں کسی کا جو بھی اقدام ہے اس میں ہم احتمال خطا کو بعید از امکان نہیں سمجھتے خواہ وہ اقدام حضرت علیؑ کا ہو خواہ حضرت ابو بکرؓ یا حضرت عمرؓ یا حضرت عثمانؓ کا۔ لہذا اگر کوئی شخص ان میں سے کسی کے کسی فیصلہ یا اقدام کے بارے میں یہ رائے دینا چاہے کہ فلاں معاملے میں ان سے خطا ہوئی تو اسے حق ہے وہ کہہ سکتا ہے۔ البتہ دلیل سے بات کرے اور اسے اجتہادی خطا سمجھے تو یہ بات ہمارے عقیدے سے نہیں ٹکرائے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ پوری چودہ سو سال کی تاریخ میں حضرت ابو بکرؓ کے دور سے لے کر آج تک کسی شخص نے صدیق اکبرؓ کی کسی خطا کو پکڑا نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ کہتے ہیں کہ امکان خطا موجود تھا اور وہ معصوم عن الخطا نہیں تھے۔ لہذا کوئی شخص اگر یہ کہنا چاہے کہ ان سے خطا ہوئی یہ نہ کرتے یا یوں کرتے تو بہتر تھا تو ہم اس کی زبان نہیں پکڑیں گے چونکہ ہم ان کی معصومیت کے قائل ہی نہیں ہیں۔ حضرت عمرؓ کو تو خود اپنی بعض اجتہادی آراء میں خطا کا احساس ہوا جن سے انہوں نے علیؑ کو رجوع کر لیا۔ البتہ اپنی ایک خطا کا وہ صرف اعتراف کر سکے اس کا ازالہ نہ ہو سکا۔ وہ یہ کہ حضرت ابو بکرؓ کے عہد خلافت میں خود انہوں نے حضرت ابو بکرؓ پر زور دے کر وظائف کے تعین کے معاملے میں ایک فرق رکھوایا، یعنی یہ کہ بدری صحابہ کو دوسروں کے مقابلے میں کافی زیادہ وظیفہ ملنا چاہئے اور اصحاب شجرہ کو بدری صحابہ سے کم لیکن دوسروں سے زیادہ وظیفہ ملنا چاہئے۔ یہ فرق مراتب حضرت عمرؓ نے رکھوایا اور اپنی حیات دُنوی کے آخری ایام میں آپ اس پر پچھتائے۔ اس کی وجہ کیا تھی وہ بھی جان لیجئے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مسلمانوں کے جوش جہاد اور شوق شہادت کی وجہ سے نہایت عظیم الشان فتوحات ہوتی چلی گئیں اور مالی غنیمت بے حد و حساب دارالاسلام میں آنے لگا۔ اب جو بڑے بڑے وظائف باقاعدگی سے ملے تو اس نے سرمایہ داری کی شکل اختیار کر لی

اس لئے کہ معاشرے میں بالفعل یہ صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ صدقہ خیرات لینے والا کوئی مستحق ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا تھا۔ بنا بریں ارتکازِ دولت کی شکل پیدا ہونی شروع ہو گئی اور وظائف میں فرق و تفاوت نے اصحابِ دولت و ثروت کے مابین بھی عظیم فرق و تفاوت پیدا کر دیا۔ اگر وہ دولت کسی ہموار و مساوی طریقے پر منتقل ہوتی تو یہ صورت حال رونما نہ ہوتی۔ یہ وہ چیز تھی جس کو دیکھ کر حضرت عمر فاروقؓ نے کہا تھا کہ:

”لو استقبلت ما استدرت لآخذت فضول اموال الاغنياء ولقسمته

بين الناس“..... او كما قال

”اب اگر کہیں وہ صورت حال دوبارہ پیدا ہو جائے جواب پیچھے جا چکی ہے تو میں

لوگوں کے اموال میں جو فاضل ہے، وہ لے کر دوسرے لوگوں میں تقسیم کر دیتا۔“

پس معلوم ہوا کہ آنجناب کو ایک احساس ہوا۔ یہ بات میں نے صرف اس لئے عرض کی ہے کہ اہل سنت کا یہ موقف واضح ہو جائے کہ خطاء کا احتمال و امکان ہر صحابی کے بارے میں ہو سکتا ہے، لیکن ہم اس خطاء کو اجتہادی خطاء قرار دیں گے اور اسے نیک نیتی پر محمول کریں گے۔ یہ بات ہر صحابی کے بارے میں کہی جائے گی۔ یہی بات اور یہی رائے نہ صرف حضرت امیر معاویہؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بارے میں کہی جاسکتی ہے بلکہ حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے بارے میں بھی۔ یہاں تک کہ حضراتِ شیخین اور حضرت عثمانؓ ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔

لہذا یہ بات پیش نظر رکھئے کہ اب گفتگو کا جو مرحلہ آ رہا ہے جو حضرت امیر معاویہؓ کے ایک اہم اقدام سے متعلق ہے، اس کے بارے میں بھی دورانیں ممکن ہیں۔ ان کو یہ بات حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے سوچائی (جو مسلمہ طور پر ایک نہایت ذہین و فہیم مدبر اور دُور رس نگاہ رکھنے والے صحابی مانے جاتے ہیں) کہ ”دیکھئے مسلمانوں میں آپس میں جو کشت و خون ہوا اور پانچ برس کا جو عرصہ آپس کی لڑائی جھگڑے میں گزرا، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے بعد پھر وہی حالات پیدا ہو جائیں۔ لہذا اپنی جانشینی کا مسئلہ اپنی

زندگی ہی میں طے کر کے جائیے۔“ اب کوئی شخص چاہے (اور ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے) تو وہ بڑی آسانی سے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر یہ فتویٰ لگا دے کہ انہوں نے کسی لالچ اور کسی انعام کی امید کی وجہ سے یا چالپوسی کے خیال سے یہ رائے دی۔ معاذ اللہ! ہم یہ رائے نہیں دے سکتے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ صحابہ رسول اللہ ﷺ میں شامل ہیں جنہوں نے حدیبیہ میں نبی اکرم ﷺ کے دست مبارک پر وہ بیعت کی تھی جس کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے، اور اس بیعت پر سورہ فتح میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ اصحاب شجرہ میں سے ہیں۔ پھر حضرت علیؓ کے پورے عہد حکومت میں وہ حضرت علیؓ کے بڑے حامیوں (Supporters) میں رہے اور ہر مرحلے میں انہوں نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا۔ لیکن وہ امت کے حالات کو دیکھ رہے تھے۔ آپس کی خانہ جنگی کا انہیں تلخ اور دردناک تجربہ ہوا تھا۔ وہ جو انگریزی کی مثل ہے کہ ”بہت سا پانی دریا میں بہ گیا ہے“ اس کے مصداق حالات میں بہت کچھ تبدیلی آ چکی ہے۔ یہ ۶۰ ہجری کے لگ بھگ کا زمانہ ہے۔ آنحضرت ﷺ کی وفات پر پورے پچاس برس گزر چکے ہیں۔ کبار صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی عظیم اکثریت اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔ اب تو صغار صحابہ میں بھی کچھ ہی لوگ موجود ہیں اور یہ گویا صحابہ کی دوسری نسل کے افراد ہیں جیسے حضرت زبیر بن العوامؓ شہید ہو چکے، اب ان کے بیٹے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ ہیں۔ حضرت عمرؓ شہید ہو چکے، اب ان کے بیٹے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ ہیں۔ حضرت عباسؓ اللہ کو پیارے ہو چکے البتہ ان کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ موجود ہیں۔ اسی طرح حضرت ابو بکرؓ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمن بن ابو بکرؓ ہیں۔ الغرض چند صغار صحابہؓ کو چھوڑ کر تقریباً ننانوے فی صد لوگ تو بعد کے ہیں۔ پھر وہ جوش و جذبہ ایمانی بھی پچاس سال کے بعد اس درجے کا نہ رہا تھا جو خلافت راشدہ کے ابتدائی پچیس سال تک نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں ”جو ہر اندیشہ“ اور شدت احساس کا عالم تو یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے دور میں ایک موقع پر جب کچھ عیسائی آئے اور ان کو قرآن مجید کی آیات سنائی گئیں اور شدت

تاثر سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تو خود حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:
 ”هكذا كنا حتى قَسَمَتِ الْقُلُوبُ“

”یہی حال کبھی ہمارا ہوا کرتا تھا کہ قرآن مجید پڑھتے تھے اور سنتے تھے تو ہماری
 آنکھوں سے آنسو جاری ہو جایا کرتے تھے یہاں تک کہ دل سخت ہو گئے۔“

ذرا غور فرمائیے یہ بات حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اپنے متعلق فرما رہے ہیں کہ ہمارے دل
 سخت ہو گئے۔ اسی طرح انتقال کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے بارے میں فرماتے ہیں
 کہ ”میں اگر برابر برابر پر چھوٹ جاؤں تو بہت بڑی کامیابی سمجھوں گا۔“ پھر یہی
 حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں جو حضرت حدیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھتے تھے کہ: ”میں قسم دے کر تم
 سے پوچھتا ہوں، کہیں میرا نام ان منافقوں کی فہرست میں تو نہیں تھا جن کے نام نبی
 اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں بتائے تھے؟“ تو ان جلیل القدر صحابہ کے شدتِ احساس کی اگر یہ
 صورت تھی تو آپ سوچئے کہ ”تاہہ دیگر اں چہ رسد!“ لہذا ان حالات میں حضرت
 مغیرہ رضی اللہ عنہ کی سمجھ میں مصالحتِ امت کا یہی تقاضا آیا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنا کوئی
 جانشین نامزد فرمادیں چونکہ اس وقت فی الواقع بحیثیت مجموعی امت کے حالات اس
 جمہوری اور شورائی مزاج (Republican Character) کے متحمل نہیں رہے
 ہیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا فرمایا تھا۔ لہذا حالات کے پیش نظر ایک سیڑھی نیچے اتر
 کر فیصلہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے دلائل کے ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے
 اصرار کیا کہ وہ اپنا جانشین نامزد کریں اور اس کی بیعت ولی عہدی لیں۔ پھر ان ہی نے
 جانشینی کے لئے یزید کا نام تجویز کیا۔ یہاں یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہئے کہ جو شخص
 کسی بھی درجے میں حضرت مغیرہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بدینیت قرار
 دے گا، اس کا معاملہ اہل سنت سے جدا ہو جائے گا۔ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ
 ”الصحابۃ کلہم عدول“۔ بدینتی کی نسبت ہم ان کی طرف نہیں کر سکتے، اختلاف
 کر سکتے ہیں۔ ہم انہیں معصوم نہیں مانتے۔ ان سے خطا ہو سکتی ہے۔ ان کے کسی فیصلہ
 کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ یہ صحیح فیصلہ نہیں تھا۔ کوئی یہ کہے تو اس سے اس کے ایمان

عقیدہ اور اہل سنت میں سے ہونے پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ یہ رائے دی جاسکتی ہے۔ لیکن جو شخص بد نیتی کو کسی صحابی رسولؐ کی طرف منسوب کرتا ہے تو جان لیجئے کہ وہ خواہ اور کچھ بھی ہو بہر حال اہل سنت والجماعت میں شمار نہیں ہوگا۔

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے یعنی یہ کہ جن کی نیک نیتی ہر شبہ سے بالاتر ہے انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ عمل اسلام کے مزاج کے ساتھ مناسبت رکھنے والا نہیں ہے۔ ان میں پانچ نام بہت مشہور ہیں۔ تین تو اُمت کے مشہور ”عہادہ“ میں سے ہیں یعنی حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ، عبد اللہ بن عمرؓ اور عبد اللہ بن عباسؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ ایک حضرت حسینؓ ابن علیؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور ایک حضرت ابو بکرؓ کے صاحبزادے حضرت عبد الرحمنؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ انہوں نے بڑی بڑی بیعتوں کی عہدی سے انکار کیا۔ اور ذہن میں رکھے کہ یہ تاریخی جملہ حضرت عبد الرحمنؓ بن ابی بکرؓ کا ہے کہ جب مدینہ کے گورنر نے ولی عہدی کی بیعت لینی چاہی ہے تو انہوں نے بڑے غصے سے کہا کہ ”کیا اب تم رسول اللہؐ اور خلفائے راشدین کی سنت کے بجائے قیصر و کسریٰ کی سنت رائج کرنا چاہتے ہو کہ باپ کے بعد بیٹا جانشین ہو“۔

تیسری جانب یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ ان پانچ حضرات کو چھوڑ کر امت کی عظیم ترین اکثریت نے بیعت کر لی جس میں کثیر تعداد میں صحابہؓ بھی شامل تھے۔ اب اس واقعہ کے بعد اگر کوئی چاہے تو ان سب کو بے ضمیر قرار دے دے۔ کسی کی زبان کو تو نہیں پکڑا جاسکتا۔ کہنے والے یہ بھی کہہ دیں گے کہ حضرت امیر معاویہؓ نے ان کے ایمان دولت کے ذریعے خرید لئے تھے۔ لیکن ذرا توقف کر کے غور فرمائیجئے کہ صحیح ”ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں“ کے مصداق سب سے پہلے اس زد میں حضرت حسنؓ کی ذات گرامی آئے گی۔ گویا انہوں نے حضرت معاویہؓ کے حق میں دولت کے عوض دستبرداری قبول کر کے اپنی خلافت فردخت کی تھی۔ معاذ اللہ! تم معاذ اللہ!..... لیکن ایسی بات کہنے والوں کو شصتے دل سے سوچنا چاہئے کہ اس طرح بد فہم ملامت و اہانت کون کون سی لائق صد احترام ہستیاں بنتی ہیں۔ ہم ان سب کو نیک

نیت سمجھتے ہیں۔ جو بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس وقت موجود تھے ان میں سے جنہوں نے ولی عہدی کی بیعت کی اور جنہوں نے انکار کیا وہ سب کے سب نیک نیت تھے۔ سب کے پیش نظر امت کی مصلحت تھی۔ حضرت حسن نے جو ایثار فرمایا تھا وہ تو تا قیام قیامت زوالنا ضروری ہے۔ یہ رائے ان کی اور پورن ٹیٹ بی کئے کی۔ ہر سہ کوہ کئے سوں ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے برابر ان کو پیغامات بھیج رہے تھے اور کوفیوں کے خطوط سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس بوریاں بھر گئی تھیں۔ یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ کوفہ صرف ایک شہر ہی نہیں تھا بلکہ سیاسی اور فوجی حیثیت سے اس کی بھی بڑی اہمیت تھی۔ لہذا آنجناب کی رائے تھی کہ اہالیان کوفہ کے تعاون سے وہ حالات کا رخ صحیح جانب موڑ سکتے ہیں۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ایسے تمام معاملات اجتہادی ہوتے ہیں۔ اس رائے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی شریک تھے کہ ولی عہدی کی جو رسم پڑ گئی ہے وہ اسلام کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی لیکن وہ آگے جا کر اختلاف کرتے ہیں۔ ان کا اختلاف کامیابی کے امکانات کے بارے میں تھا۔ وہ کوفہ والوں کو قطعاً ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ کسی اقدام سے پہلے خوب اچھی طرح جائزہ لینا ہوتا ہے کہ اقدام کے لئے جو وسائل و ذرائع ضروری ہیں وہ موجود ہیں یا نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل

ایمان پر قتال مکہ میں فرض نہیں ہوا تھا بلکہ مدینہ میں ہوا، جبکہ اتنی قوت بہم پہنچ گئی تھی کہ قتال سے اچھے نتائج کی توقع کی جاسکے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی مخلصانہ رائے تھی کہ کامیاب اقدام کے لئے جو اسباب درکار ہیں، وہ فی الوقت موجود نہیں ہیں۔ لہذا وہ حضرت حسینؓ کو کوفہ والوں کی دعوت قبول کرنے اور وہاں جانے سے باصرار والحاظ منع کرتے رہے۔ لیکن حضرت حسینؓ کی رائے یہ تھی کہ کوفہ والوں کی دعوت قبول کرنی چاہئے۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ جو سچا انسان ہوتا ہے وہ اپنی سادگی اور شرافت میں دوسروں کو بھی سچائی سمجھتا ہے اور اپنی صداقت کی بنیاد پر دوسروں سے بھی حسن ظن رکھتا ہے۔ کوفہ کوئی معمولی شہر نہیں تھا، انتہائی Strategic مقام پر واقع تھا۔ یہ سب سے بڑی چھاؤنی تھی جو حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں قائم کی گئی تھی، اس لئے کہ یہ وہ مقام ہے جس سے اُس شاہراہ کا کنٹرول ہوتا ہے جو ایران اور شام کی طرف جاتی ہے۔ لہذا حضرت حسینؓ یہ رائے رکھتے تھے کہ اگر کوفہ کی عظیم اکثریت ان کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہے، جیسا کہ ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے تو اس کے ذریعے اسلامی نظام میں لائی جارہی تبدیلی کا ازالہ کیا جاسکتا ہے اور اس کا راستہ روکا جاسکتا ہے۔ لیکن اس رائے سے اختلاف کر رہے ہیں حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین۔ یہ اختلاف بھی معاذ اللہ بدینتی پر مبنی نہیں تھا۔ حضرت حسینؓ بھی اور یہ تینوں عبادلہ بھی نیک نیت تھے۔ ان تینوں حضرات نے لاکھ سمجھایا کہ آپ کوفہ والوں پر ہرگز اعتماد نہ کیجئے۔ یہ لوگ قطعی بھروسے کے لائق نہیں ہیں۔ یہ لوگ جو کچھ آپ کے والد بزرگوار کے ساتھ کرتے رہے ہیں اس کو یاد کیجئے۔ جو کچھ آپ کے برادر محترم کے ساتھ کر چکے ہیں، اس کو پیش نظر رکھئے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ان کے دل آپ کے ساتھ ہوں، لیکن ان کی تلواریں آپ کی حمایت میں نہیں اٹھیں گی بلکہ معمولی خوف یا دباؤ یا لالچ سے آپ کے خلاف اٹھ جائیں گی۔ لیکن حضرت حسینؓ کا ایک فیصلہ ہے جس پر وہ کمال استقامت کے ساتھ عمل پیرا ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس معاملہ میں فرمان خداوندی اور سید رسول ﷺ پر عمل کر رہے

ہیں یعنی ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ یعنی پہلے خوب غور کر لو سوچ لو امکانات کا جائزہ لے لو۔ تدبیر کو بروئے کار لانا ضروری ہے۔ ساز و سامان کی فراہمی ضروری ہے۔ یہ بھی دیکھو کہ جو صورت حال (Situation) فی الواقع درپیش ہے اس کے تقاضے پورے کرنے کی اہلیت ہے یا نہیں۔ لیکن جب ان مراحل سے گزر کر ایک فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے اقدام کرو۔ ”فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ“ یہ رہنمائی ہے قرآن و سنت میں۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت حسین ؑ نے Assessment میں غلطی کی لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے کسی بد نیتی سے یا حکومت و اقتدار کی طلب میں یہ کام کیا۔ معاذ اللہ! ثم معاذ اللہ۔ اہل سنت کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں ہے۔ میں ذاتی طور پر اس بات سے کھلم کھلا اور سرعام اعلان براءت کرتا ہوں۔ اگر کسی کو یہ شک و شبہ یا غلط فہمی ہو کہ معاذ اللہ میری یہ رائے ہے کہ حضرت حسین ؑ کے اس اقدام میں کوئی نفسانیت یا کوئی ذاتی غرض تھی تو میں اس سے بالکل بری ہوں۔ الحمد للہ! ثم الحمد للہ۔ کسی کی یہ رائے اگر ہو تو ہو لیکن اچھی طرح جان لیجئے کہ اہل سنت کے جو مجموعی اور مجمع علیہ عقائد ہیں ان میں یہ بات شامل ہے کہ حضرت حسین ؑ کے اقدام اور مشاہرت صحابہ کے ضمن میں کسی صحابی رسول پر بد نیتی اور نفسانیت کا حکم لگانے سے ایمان میں خلل واقع ہوگا۔ بلا تخصیص ہم تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو عدول مانتے ہیں البتہ معصوم کسی کو نہیں مانتے اور ہر ایک سے خطا و اجتہادی کے احتمال و امکان کو تسلیم کرتے ہیں۔ حضرت حسین ؑ کی نیک نیتی سے ایک رائے تھی، نیک نیتی ہی سے ایک اندازہ (Assessment) تھا اور جب اس پر انشراح ہو گیا تو دین ہی کے لئے عزیمت تھی۔

جب ولی عہدی کی بیعت کا مسئلہ مدینہ منورہ میں پیش ہوا تھا تو حضرت عبداللہ بن زبیر ؑ وہاں سے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے۔ حضرت حسین ؑ نے بھی ایسا ہی کیا۔ چند حضرات کی رائے یہ تھی کہ مکہ مکرمہ ہی کو Strong-Hold اور اصل Base بنایا جائے اور اس ولی عہدی کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے اپنی قوتوں کو مجتمع کیا

جائے۔ ابھی اس سلسلہ میں کوئی مؤثر کام شروع نہیں ہو سکا تھا کہ حضرت امیر معاویہ
 ؓ کا انتقال ہو گیا اور بحیثیت ولی عہد حکومت امیر یزید کے ہاتھ میں آ گئی، جس کے
 بعد کوفہ والوں نے خطوط بھیج بھیج کر حضرت حسین ؓ کو اپنی وفاداری اور آپ کے ہاتھ
 پر بیعت کر کے جدوجہد اور اقدام کا یقین دلایا۔ آنجناب نے تحقیق حال کے لئے اپنے
 چچا زاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل ؓ کو کوفہ بھیجا۔ ان کی طرف سے بھی اطلاعات یہی
 موصول ہوئیں کہ اہل کوفہ بدل و جان ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں۔ حضرت حسینؑ نے
 کوفہ کے سفر کا ارادہ کر لیا اور کوچ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؑ
 اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ دونوں نے بہت سمجھایا کہ مکہ سے نہ نکلے۔ یہ دونوں حضرات یہ
 کہتے ہوئے رو پڑے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح امیر المومنین حضرت عثمان ؓ کو
 ان کے گھر والوں کے سامنے ذبح کر دیا گیا اسی طرح آپ کے اہل و عیال کے سامنے
 آپ کو بھی ذبح کر دیا جائے۔ جب حضرت حسینؑ نے کوچ کیا ہے تو حضرت عبداللہ بن
 عباسؑ ان کی سواری کے ساتھ دوڑتے ہوئے دور تک گئے ہیں اور اصرار کرتے رہے
 ہیں کہ خدا کے لئے باز آ جائیے اور اگر جانا ہی ہے تو خواتین اور بچوں کو تو ساتھ لے کر
 نہ جائیے۔ اور یہ حضرت عبداللہ بن عباسؑ کون ہیں! رشتے میں ایک جانب سے
 حضرت حسینؑ کے چچا لگتے ہیں تو دوسری طرف نانا۔ اس لئے کہ والد یعنی حضرت علیؑ کے
 چچا زاد بھائی ہیں اور نانا یعنی نبی اکرم ﷺ کے بھی چچا زاد بھائی ہیں! لیکن اس وقت
 محبت سے مغلوب ہو کر کہہ رہے ہیں: اے ابن عم! خدا کے لئے باز آ جاؤ یا کم از کم ان
 عورتوں اور بچوں کو مکہ مکرمہ ہی میں چھوڑ جاؤ۔ لیکن نہیں، دوسری جانب عزیمت کا ایک
 کوہ گراں ہے، پیکر شجاعت ہے، سراپا استقامت ہے۔ نیک نیتی سے جو فیصلہ کیا ہے، اس
 پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد راستے میں جب اطلاع ملی کہ حضرت مسلم بن عقیلؓ جو
 اپنی اور تحقیق کنندہ کی حیثیت سے کوفہ گئے تھے وہاں شہید کر دیئے گئے اور کوفہ والوں
 کے کانوں پر جوں تک نہیں رہی۔ سب کے سب نے گورنر کوفہ کے سامنے حکومت
 وقت کے ساتھ وفاداری کا عہد استوار کر لیا ہے۔ تو حضرت حسینؑ نے سوچنا شروع

کیا کہ سفر جاری رکھا جائے یا مکہ واپسی ہو۔

لیکن ذہن میں رکھئے کہ ہر قوم کا ایک حراج ہوتا ہے جو انسان کی شخصیت کا جزو لاینفک ہوتا ہے۔ عرب کا حراج یہ تھا کہ خون کا بدلہ لیا جائے خواہ اس میں خود اپنی جان سے بھی کیوں نہ ہاتھ دھو لینے پڑیں۔ چنانچہ حضرت مسلمؓ کے عزیز رشتہ دار کھڑے ہو گئے کہ اب ہم ان کے خون کا بدلہ لئے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ حضرت حسینؓ کی شرافت اور مروّت کا تقاضا تھا کہ وہ ان لوگوں کا ساتھ نہ چھوڑیں جو ان کے مشن میں ان کا ساتھ دینے کے لئے نکلے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت مسلم بن عقیلؓ کے خونِ ناحق کا بدلہ لینے کے عزم کا اظہار کرنے والوں کا ساتھ یہ پیکر شرافت و مروّت نہ دیتا! لہذا سفر جاری رہا۔ اسی دوران حضرت عبداللہ بن جعفر طیارؓ جو چچا زاد بھائی ہیں ان کے بیٹے حضرت عون اور حضرت محمد ان کا پیغام لے کر آئے ہیں کہ ”خدا کے لئے اُدھر مت جاؤ“۔ لیکن فیصلہ اٹل ہے۔ ان دونوں کو بھی ساتھ لیتے ہیں اور سفر جاری رہتا ہے حتیٰ کہ قافلہ دشتِ کربلا میں پہنچ گیا۔ اُدھر کوفہ سے گورنر ابن زیاد کا لشکر آ گیا۔ یہ لشکر ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا اور اس کو صرف ایک حکم تھا کہ وہ حضرت حسینؓ کے سامنے یہ دو صورتیں پیش کرے کہ آپ نہ کوفہ کی طرف جاسکتے ہیں نہ مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ کی طرف مراجعت کر سکتے ہیں ان دونوں سمتوں کے علاوہ جدھر آپ جانا چاہیں اس کی اجازت ہے۔

یہاں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ تیسرا راستہ کون سا ہو سکتا تھا! وہ راستہ تھا دمشق کا۔ لیکن افسوس کہ حضرت حسینؓ نے اسے اختیار نہ کیا بلکہ آپ وہیں ڈٹے رہے۔ اب عمرو بن سعد کی قیادت میں مزید چار ہزار کا لشکر کوفہ پہنچ گیا۔ اور یہ عمرو بن سعد کون تھے؟ افسوس کہ ان کے نام کو گالی بنا دیا گیا ہے۔ یہ تھے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فاتحِ ایران اور یکے از عشرہ مبشرہ کے بیٹے جن کی حضرت حسینؓ کے ساتھ قربت داری بھی ہے۔ وہ بھی مصالحت کی انتہائی کوشش کرتے ہیں اور گفت و شنید جاری رہتی ہے۔ اب حضرت حسینؓ کی طرف سے تین صورتیں پیش ہوتی ہیں۔ یعنی یہ

کہ: ”یا مجھے مکہ مکرمہ واپس جانے دو یا مجھے اسلامی سرحدوں کی طرف جانے دو تاکہ میں کفار کے خلاف جہاد و قتال میں اپنی زندگی گزار دوں یا میرا راستہ چھوڑ دو۔ میں دمشق چلا جاؤں۔ میں یزید سے اپنا معاملہ خود طے کر لوں گا۔“ لیکن اب گھیرا تنگ ہو گیا ہے اور صورت حال یکسر بدل گئی ہے۔ یہ بھی خوب جان لیجئے کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے! حضرت حسینؑ نے میدان کر بلا میں ابن زیاد کے بھیجے ہوئے لشکروں کے سامنے جو خطبات دیئے اس میں انہوں نے بھانڈا پھوڑ دیا کہ میرے پاس کوئیوں کے خطوط موجود ہیں جنہوں نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ انہوں نے اس کوئی فوج کے بہت سے سرداروں کے نام لے لے کر فرمایا ”اے فلاں ابن فلاں! یہ تمہارے خط ہیں کہ نہیں؟ جن میں تم نے مجھ سے بیعت کرنے کے لئے مجھے کو ذمہ آنے کی دعوت دی تھی۔“ اس پر وہ لوگ براءت کرنے لگے کہ نہیں ہم نے یہ خطوط نہیں بھیجے۔ اب ان کی جان پر بنی ہوئی تھی، کیونکہ مصالحت کی صورت میں حکومت وقت سے ان کی غداری کا جرم ثابت ہو جاتا۔ جنگ جمل اور جنگ صفین کے واقعات یاد کیجئے۔ جہاں بھی مصالحت کی بات ہوگی وہاں وہی سبائی فتنہ آڑے آئے گا جو اس سارے انتشار و افتراق اور خانہ جنگیوں کا بانی رہا ہے۔ مصالحت کی صورت میں تو ان کا کچا چٹھا کھل جاتا اور معلوم ہو جاتا کہ دوستی کے پردوں میں رہ کر کون دشمنی کرتا رہا ہے اور وہ کون ہیں جو سادہ لوح عوام کو دھوکا دے کر اور خواص کو بہلا پھسلا کر مسلمان کو مسلمان کے خلاف محاذ آرا کرتے رہے ہیں۔ حضرت حسینؑ کے پاس کوئیوں کے بور یوں بھرے خطوط تھے۔ مفاہمت کی صورت میں جب یہ سامنے آتے تو ان کا حشر کیا ہوتا اس کو اچھی طرح آج بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان سرداروں اور ان کے خوار یوں نے مصالحت و مفاہمت کا سلسلہ جاری رہنے نہیں دیا اور عمرو بن سعد کو مجبور کر دیا کہ وہ حضرت حسینؑ کے سامنے یہ شرط پیش کرے کہ یا تو غیر مشروط طور پر Surrender کیجئے ورنہ جنگ کیجئے۔ یہ سازشی لوگ حضرت حسینؑ کے مزاج سے اتنے ضرور واقف تھے کہ ان کی غیرت و حمیت غیر مشروط طور پر حواگی کے لئے تیار نہیں ہوگی اور فی الواقع ہوا بھی یہی۔

یہاں یہ جان لیجئے کہ معاملہ تھا حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کا! اُن کی غیرت اُن کی حمیت اُن کی شجاعت اس توہین و تذلیل کو ہرگز گوارا نہ کر سکتی تھی۔ لہذا انہوں نے غیر مشروط Surrender کرنے سے انکار کر دیا اور مسلح تصادم ہو کر رہا جس کے نتیجے میں سانحہ کربلا واقع ہوا۔ دادِ شجاعت دیتے ہوئے آپ کے ساتھی شہید ہوئے۔ آپ کے اعزہ و اقارب نے اپنی جانیں نچھاور کیں اور آپ نے بھی گوارا چلاتے ہوئے اور دشمنوں کو قتل کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

یہ ہے اصل حقیقت اس سانحہ فاجعہ کی۔ اصل سازشی ذہن کو پچھانئے! جیسے حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان اختلاف کا افسانہ جس نے بھی تراشا ہے بڑی عیارانہ مہارت سے تراشا اور گھڑا ہے۔ اس افسانے سے حقائق کم کر دیئے گئے ہیں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ اصل مجرم کو Pin-Point کیا جائے، کوئی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تنقید کا ہدف بناتا ہے تو کوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو۔ اس طرح یہ دونوں فریق ان سازشی سبائیوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شخصیت مجروح ہوتی ہے تو بھی ان کا کام بنتا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی مجروح ہوتی ہے تو بھی ان کے پوراہہ ہوتے ہیں۔ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کون ہیں؟ یہ ہیں ذوالنورین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوہرے داماد اور یکے از مشرہ مشرہ۔ اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کون ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ آپ کے چچا زاد بھائی آپ کے داماد آپ کے محبوب اور یکے از مشرہ مشرہ۔ ان دونوں میں سے کسی کی بھی شخصیت مجروح ہوتی ہے تو اس کی زد پڑتی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر جو ان دونوں کے مرکز و مربی تھے۔ ان شخصیتوں میں اگر نقص اور عیب مانا جائے گا تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت پر حرف آئے گا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت مبارکہ مجروح ہوگی۔ افسوس کہ آج بھی اُن سبائیوں کا کام دونوں طرف سے بن رہا ہے۔

خوب جان لیجئے کہ ایسے تمام لوگ چاہے وہ اس کا شعور رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں سبائی ایجنٹ ہیں۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ ”الصحابہ کلہم عدول“۔ کوئی

بدلتی اور نفسانیت نہ حضرت عثمان میں تھی نہ حضرت علی میں نہ حضرت مجاہدہ میں تھی نہ حضرت مغیرہ بن شعبہ میں نہ حضرت عمرو بن العاص میں تھی نہ حضرت ابو موسیٰ اشعری میں نہ حضرت حسین بن علی میں تھی نہ حضرت عبداللہ بن عباس یا عبداللہ بن عمر میں رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ ہاں ایک فتنہ تھا جس نے ہر مرحلہ پر جب بھی مصالحت و مفاہمت کی صورت پیدا ہوتی نظر آئی، اس کو تار پھڑو کیا اور اس کے بجائے ایسی نازک صورت حال (Critical Situation) پیدا کر دی کہ کشت و خون ہو، مسلمان ایک دوسرے کی گردنوں پر تلواریں چلائیں، فتنہ اور بھڑکے، حق کے سیلاب کے آگے بند باندھا جاسکے اور ع ”رکتا نہ تھا کسی سے سل رواں ہمارا“ والی صورت ختم ہو سکے۔ چنانچہ کون انصاف پسند ایسا ہوگا جو نہ جانتا ہو کہ حضرت ذوالنورین ؓ کی مظلومانہ شہادت سے لے کر کربلا کے سانحہ فاجعہ تک مسلمانوں کی آپس میں جو صلح آویزش رہی ہے اس میں در پردہ ان سبائیوں ہی کا ہاتھ تھا۔ مستند تواریخ اس حقیقت پر شاہد ہیں، البتہ ان کو نگاہ حقیقت بین اور انصاف پسندی کے ساتھ پڑھنا ہوگا۔ جنگ جمل میں حضرت علی ؓ کو فتح ہوئی۔ آنجناب نے حضرت عائشہ صدیقہ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ بالکل وہی جو ایک بیٹے کو ماں کے ساتھ کرنا چاہئے۔ چالیس خواتین اور حضرت صدیقہ کے لشکر کے معتبر ترین لوگوں کے ہمراہ پورے ادب و احترام کے ساتھ ان کو مدینہ منورہ پہنچا دیا۔ معلوم ہوا کہ نہ ذاتی دشمنی تھی نہ بغض و عناد۔ اور ادھر کیا ہوا؟ معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ، کیا امیر یزید نے خاندان رسالت کی خواتین کو اپنی لوٹیاں بنایا؟ آخر وہ دمشق بھیجی گئی تھیں، لیکن وہاں کیا ہوا؟ ان کا پورا احترام کیا گیا، ان کی دلجوئی کی گئی، ان کی خاطر مدارات کی گئی۔ امیر یزید نے انتہائی تاسف کا اظہار کیا اور کہا کہ ”ابن زیاد اس حد تک نہ بھی جاتا تو بھی میں اس سے راضی رہ سکتا تھا۔ کاش وہ حسین ؓ کو میرے پاس آنے دیتا، ہم خود ہی باہم کوئی فیصلہ کر لیتے۔“ لیکن کربلا میں جو کچھ ہوا، وہ اس فتنے کی وجہ سے ہوا جو کوفیوں نے بھڑکایا تھا۔ وہ اپنی دو عملی اور منافقت کی پردہ پوشی کے لئے نہیں چاہتے تھے کہ مصالحت و مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو۔ ان کو جب محسوس ہوا کہ ہماری

سازش کا بھانڈا پھوٹ جائے گا تو انہوں نے وہ صورت حال پیدا کر دی جو ایک نہایت دردناک اور الم انگیز انجام پر منتج ہوئی۔

یہ سانحہ قاہرہ انتہائی افسوس ناک تھا، اس سے کون اختلاف کر سکتا ہے! اس نے تاریخ پر جو گہرے اثر ڈالے ہیں، وہ اظہر من الشمس ہیں۔ اس کڑوے اور کیلے پھل کا مزہ امت چودہ سو سال سے چکھتی چلی آ رہی ہے۔ ان دو واقعات یعنی شہادت حضرت عثمان اور شہادت حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی وجہ سے ہمارے درمیان افتراق، انتشار، اختلاف اور باہمی دست و گریباں ہونے کی جو فضا چلی آ رہی ہے اس پر ان لوگوں کے گمروں میں کمی کے چراغ جلتے ہیں جنہوں نے اس کی بنیاد ڈالی۔ جہاں جہاں اس کے اثرات پہنچے، درحقیقت کامیابی ہوئی ہے ان کو جو دراصل ان فتنوں کی آگ کو بھڑکانے والے تھے۔ اب کوئی یزید کے نام کو گالی بنائے پھرتا ہے، کسی نے شمر کے نام کو گالی بنایا ہوا ہے، کوئی عمرو بن سعد کے نام کو گالی بنائے ہوئے ہے۔ یہاں تک بات پہنچی ہے کہ لوگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شان میں بھی تو ہیں آمیز اور گستاخانہ انداز اختیار کرنے سے نہیں چوکتے۔ اللہ تعالیٰ ایسے سب لوگوں کو ہدایت دے اور ہمیں ان میں شامل ہونے سے بچائے اور اپنی پناہ میں رکھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک کو ہمیشہ مد نظر رکھنے کی توفیق عطا فرمائے کہ:

”اللَّهُ فِي أَصْحَابِي لَا تَتَّخِذُوهُمْ غَرَضًا مِنْ بَعْدِي فَمَنْ أَحْبَبَهُمْ

فِيحِبِّي أَحِبَّهُمْ وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَيَبْغِضِي أَبْغَضَهُمْ.....“

وَأَخِرُ دَعْوَانَا إِنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

کر بلا کی کہانی

حضرت ابو جعفر محمد باقرؑ کی زبانی

ترجمہ: مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی

(ماخوذ از ہفت روزہ "اسلام" لاہور)

روایت کے راوی عمار رضی نے کہا کہ میں نے محمد بن علی بن الحسینؑ سے عرض کیا کہ آپ مجھ سے واقعہ قتل حسینؑ ایسے انداز سے بیان فرمائیں کہ گویا میں خود وہاں موجود تھا اور یہ سانسے ہو رہا ہے۔ اس پر حضرت محمد باقرؑ نے فرمایا: امیر معاویہؓ کے انتقال کے وقت حضرت معاویہؓ کا بھتیجا یزید کا چچیرا بھائی ولید بن عقبہ بن ابی سفیان مدینہ منورہ کا گورنر تھا۔ ولید نے حسب دستور حضرت حسینؑ کو پیغام بھیجا تا کہ ان سے نئے امیر یزید کے لئے بیعت لیں۔ حضرت حسینؑ نے جواب میں فرمایا کہ سر دست آپ سوچنے کی مہلت دیں اور اس بارے میں نرمی اختیار کریں۔ ولید نے ان کو مہلت دے دی۔ حضرت حسینؑ مہلت پا کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔

دریں اثناء جب کوفہ والوں کو اس کا پتہ چلا کہ حضرتؑ تو مکہ شریف پہنچ گئے ہیں تو انہوں نے اپنے قاصد حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں روانہ کئے اور ان سے درخواست کی کہ آپ کوفہ تشریف لے آئیں ہم اب آپ ہی کے ہو گئے ہیں۔ ہم لوگ یزید کی بیعت سے منحرف ہیں۔ ہم نے گورنر کوفہ کے پیچھے جمعہ پڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ اس وقت حضرت نعمان بن بشیر انصاریؓ یزید کی طرف سے کوفہ کے گورنر تھے۔ جب اہل کوفہ کی طرف سے اس قسم کی درخواستیں آئیں تو حضرت حسینؑ نے اپنے چچیرے بھائی حضرت مسلم بن عقیلؓ کو کوفہ بھیجنے کا پروگرام بنایا تا کہ وہ وہاں جا کر صورت حال کا اچھی طرح جائزہ لیں۔ اگر اہل کوفہ کے بیانات صحیح ہوئے تو خود بھی کوفہ پہنچ جائیں گے۔

حضرت مسلم کی کوفہ کو روانگی

قرارداد کے مطابق حضرت مسلم مکہ شریف سے مدینہ منورہ پہنچے وہاں سے راستہ کی راہنمائی کے لئے دو آدمی ساتھ لئے اور کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس راستہ سے وہ لے گئے اس میں ایک ایسا ترقی و دق میدان آ گیا جس میں پانی نہ ملنے کے سبب پیاس سے سخت دوچار ہو گئے۔ چنانچہ اسی جگہ ایک رہنما انتقال کر گیا۔ اس صورت حال کے پیش آنے پر حضرت مسلم نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھ کر کوفہ جانے سے معذرت چاہی لیکن حضرت ممدوح نے معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور لکھا کہ آپ ضرور کوفہ جائیں۔ بنا بریں حضرت مسلم کوفہ کی طرف چل دیے۔ وہاں پہنچ کر ایک شخص عوسج بنامی کے گھر قیام فرمایا۔ جب اہل کوفہ میں حضرت مسلم کی تشریف آوری کا چرچا ہوا تو وہ خفیہ طور پر ان کے ہاں آئے اور ان کے ہاتھ پر حضرت حسین کے لئے بیعت کرنے لگے۔ چنانچہ بارہ ہزار اشخاص نے بیعت کر لی۔ دریں اثنا یزید کے ایک کارندہ عبد اللہ بن مسلم بن شعبہ حضرمی کو اس کا پتہ چلا تو اس نے ساری کارروائی کی اطلاع گورنر کوفہ نعمان بن بشیر کو دے دی اور ساتھ ہی کہا کہ یا تو آپ واقفاً کمزور ہیں یا کوفہ والوں نے آپ کو کمزور سمجھ رکھا ہے دیکھتے نہیں کہ شہر کی صورت حال مخدوش ہو رہی ہے! اس پر حضرت نعمان نے فرمایا کہ میری ایسی کمزوری جو برمائے اطاعت الہی ہو وہ مجھے اس قوت و طاقت سے زیادہ پسند ہے جو اس کی معصیت میں ہو مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ جس امر پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈالے رکھا ہے خواہ مخواہ اس پردہ کو قاش کروں۔ اس پر عبد اللہ نے کورنے یہ سارا ماجرا یزید کو لکھ کر بھیج دیا۔ یزید نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام سرحون نامی سے اس بارے میں مشورہ لیا۔ اس نے کہا ”اگر آپ کے والد زندہ ہوتے اور آپ کو کوئی مشورہ دیتے تو اسے قبول کرتے؟“ یزید نے کہا ضرور! سرحون نے کہا ”تو پھر میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کوفہ کی گورنری عبید اللہ بن زیاد کے سپرد کر دیں۔ ادھر صورت حال ایسی تھی کہ ان دنوں یزید عبید اللہ کو پر ناراض تھا اور بصرہ کی گورنری

سے بھی اسے معزول کرنا چاہتا تھا۔ مگر سرحدوں کے مشورے پر اس نے اظہارِ پسندیدگی کرتے ہوئے بصرہ کے ساتھ کوفہ کی گورنری پر بھی عبید اللہ بن زیاد کو ناخرد کر دیا اور لکھ دیا کہ کوفہ پہنچ کر مسلم بن عقیل کو تلاش کرو، اگر مل جائے تو اس کو قتل کر دو۔

ہوئی کہ نہیں کہ نہایت کارِ راستہ نصیب ہوا لیکن یہ محسوس کر کے دکھ بھی ہو رہا ہے کہ ہماری اسکیم ابھی پختہ نہیں ہوئی۔ تاہم وہ اس غلام کو حضرت مسلم بن عقیل کے ہاں لے گیا۔ حضرت مسلم نے اس سے بیعت بھی لے لی اور رقم بھی اس سے قبول کر لی۔ اب وہ یہاں سے نکلا اور عبید اللہ بن زیاد کے پاس سیدھا پہنچا اور سب کچھ اس کو بتلا دیا۔ ادھر عبید اللہ کی کوفہ میں آمد کے بعد حضرت مسلم عوجہ کا گھر چھوڑ کر ہانی بن عمرو مرادی کے مکان پر فروکش تھے اور حضرت حسین کی خدمت میں لکھ بھیجا کہ لوگوں نے بارہ ہزار کی تعداد میں ہماری بیعت کر لی ہے آپ کوفہ تشریف لے آئیں۔

اور یہاں یہ ہوا کہ جب عبید اللہ کو پتہ چل گیا کہ حضرت مسلم ہانی کے مکان پر ہیں تو اس نے کوفہ کے سرکردہ لوگوں سے کہا کہ کیا بات ہے ہانی میرے پاس نہیں آئے! اس پر حاضرین سے ایک شخص محمد بن اشعب چند ہمرایوں کے ساتھ ہانی کے ہاں گئے تو وہ اپنے دروازے پر موجود تھے۔ ابن اشعب نے کہا کہ گورنر صاحب آپ کو یاد فرماتے ہیں اور آپ کے اب تک نہ حاضر ہونے کو بہت محسوس کرتے ہیں لہذا آپ کو چلنا چاہئے۔ چنانچہ ان کے زور دینے پر ہانی ان کے ساتھ ہولتے اور وہ عبید اللہ کے پاس پہنچے۔ اتفاق سے اس وقت قاضی شریح بھی ابن زیاد کے پاس موجود تھے۔ ان سے مخاطب ہو کر اس نے کہا، دیکھو اس ہانی کی چال کھوٹ کی مظہر ہے۔ پھر اتنے میں وہ اس کے پاس آ گیا تو کہا ”ہانی! مسلم بن عقیل کہاں ہیں؟“ اس نے کہا، مجھے علم نہیں۔ اس پر عبید اللہ نے تین ہزار درہم دینے والے غلام کو اس کے سامنے کر دیا۔ ہانی بالکل لاجواب ہو گئے، البتہ اتنا کہا کہ میں نے انہیں اپنے گھر بلایا نہیں بلکہ وہ خود میرے گھر آ کر ٹھہر گئے ہیں۔ ابن زیاد نے کہا، اچھا ان کو حاضر کرو۔ اس نے اس پر پس و پیش کیا تو ابن زیاد نے ان کو اپنے قریب بلوا کر اس زور سے چھڑی ماری جس سے اس کی بجویں پھٹ گئیں۔ اس پر ہانی نے اس کے ایک محافظ سپاہی سے تلوار چھین کر عبید اللہ پر وار کرنا چاہا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس پر ابن زیاد نے یہ کہہ کر کہ اب تمہارا خون حلال ہے، قصر امارت کے ایک حصے میں اس کو قید میں ڈال دیا۔

اس واقعہ کی اطلاع ہانی کے قبیلہ مذحج کو ہوئی تو اس نے قصر امارت پر یلغار بول دی۔ عبید اللہ نے شور سنا اور پوچھا تو کہا گیا کہ ہانی کا قبیلہ ان کو چھڑانے کے لئے آیا ہے۔ اس نے قاضی شریح کے ذریعہ ان کو کہلایا کہ ہانی کو مسلم بن عقیل کا پتہ کرنے اور بعض باتوں کی تحقیق کے لئے روک لیا گیا ہے، خطرے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن ساتھ ہی قاضی شریح پر بھی ایک غلام کو لگا دیا، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ لوگوں سے کیا کہتے ہیں! قاضی شریح لوگوں کی طرف جاتے ہوئے ہانی کے پاس سے گزرے تو اس نے قاضی صاحب سے کہا کہ میرے بارے میں اللہ سے ڈرتا، ابن زیاد میرے قتل کے

در پے ہے۔ تاہم قاضی شریح نے ہجوم کو ابن زیاد والی بات کہہ کر مطمئن کر دیا، اور لوگ بھی یہ سمجھ کر مطمئن ہو گئے کہ ہانی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

حضرت مسلم کو جب ہنگامہ کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے ذرائع ابلاغ سے کوفہ میں اعلان کر دیا، جس کے نتیجے میں چالیس ہزار لوگ ان کے پاس جمع ہو گئے۔ ان کو باقاعدہ انہوں نے ایک فوجی دستہ کی شکل دے دی جس کا مقدمہ الحیش، مینہ اور میسرہ وغیرہ سبھی کچھ تھا۔ خود حضرت مسلم بن عقیل اس کے قلب میں ہو گئے۔ اس طرح چالیس ہزار کا یہ لشکر جرار قصر امارت کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبید اللہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اہالیان کوفہ کو اپنے قصر میں بلایا۔ جب یہ لشکر قصر امارت تک پہنچ گیا تو سرداران کوفہ نے پانے اپنے قبیلے کو دیواروں کے اوپر سے گفتگو کر کے سمجھانا شروع کیا۔ اب تو حضرت مسلم کی فوج کے آدمی کھسکے شروع ہوئے اور ہوتے ہوتے شام تک صرف پانچ سو رہ گئے، حتیٰ کہ رات کے اندھیرے تک وہ بھی چل دیئے۔ جب حضرت مسلم نے دیکھا کہ وہ تنہا رہ گئے ہیں تو وہ بھی وہاں سے چل پڑے۔ راستہ میں ایک مکان کے دروازہ پر پہنچے تو ایک خاتون اندر سے آپ کی طرف نکلی۔ آپ نے اس کو پانی پلانے کے لئے کہا تو اس نے پانی تو پلا دیا لیکن اندر واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر باہر آئی تو آپ کو دروازے پر دیکھ کر اس نے کہا اے اللہ کے بندے! آپ کا اس طرح بیٹھنا مشکوک ہے، یہاں سے چلے جائیں۔ آپ نے کہا: میں مسلم بن عقیل ہوں، کیا تم مجھے پناہ دو گی؟ اس نے کہا ہاں آجائیے۔ آپ اندر چلے گئے۔ لیکن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ اس عورت کے لڑکے نے محمد بن اشعث مذکور کو اطلاع دے دی جس نے فوراً عبید اللہ تک خبر پہنچائی۔ اس نے اس کے ہمراہ پولیس کو روانہ کر دیا اور ان کو حضرت مسلم کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ پولیس نے جا کر مکان کا محاصرہ کر لیا جب کہ حضرت مسلم کو خبر تک نہ ہو سکی تھی۔ اب خود کو انہوں نے محصور پایا تو تلوار سونت کر نکل آئے اور پولیس کے مقابلے کی ٹھان لی۔ لیکن ابن اشعث نے ان کو روک کر کہا کہ میں ذمہ دار ہوں، آپ محفوظ رہیں گے۔ پس وہ حضرت مسلم کو ابن زیاد کے پاس پکڑ کر لے گئے۔ چنانچہ

ابن زیاد کے حکم سے انہیں قصر امارت کی چھت پر لے جا کر قتل کر دیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) اور ان کی لاش بازار میں لوگوں کے سامنے پھینک دی گئی۔ نیز اس کے حکم سے ہانی کو کوڑے کرکٹ کی جگہ تک گھسیٹے ہوئے لے جا کر سولی دے دی گئی۔ ادھر تو کوفہ میں یہ تک ہو گیا تھا اور.....

حضرت حسینؑ کی کوفہ روانگی

ادھر حضرت مسلم چونکہ خط لکھ چکے تھے کہ بارہ ہزار اہل کوفہ نے بیعت کر لی ہے حضرت حسینؑ جلد از جلد تشریف لے آئیں اس لئے حضرت حسینؑ مکہ شریف سے کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ تا آنکہ آپ قادسیہ سے تین میل کے فاصلے پر تھے کہ خربن یزید جسی حضرت حسینؑ کے قافلہ کو ملا۔ اس نے کہا، کہاں تشریف لے جا رہے ہو۔ آپ نے فرمایا، کوفہ۔ اس نے کہا کہ وہاں تو کسی خیر کی توقع نہیں آپ کو یہاں سے ہی واپس ہو جانا چاہئے۔ پھر کوفیوں کی بے وفائی اور حضرت مسلم کے قتل کی پوری روداد آپ کو سنائی۔ سارا قصہ سن کر حضرت حسینؑ نے تو واپسی کا ارادہ کر لیا لیکن حضرت مسلم کے بھائیوں نے یہ کہہ کر واپس جانے سے انکار کر دیا کہ ہم خونِ مسلم کا بدلہ لیں گے یا خود مارے جائیں گے۔ اس پر حضرت حسینؑ نے فرمایا، تمہارے بغیر میں جی کر کیا کروں گا۔ اب وہ سب کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب آپ کو ابن زیاد کی فوج کا ہراول دستہ نظر آیا تو آپ نے ”کر بلا“ کا رخ کر لیا اور وہاں جا کر ایسی جگہ پڑاؤ ڈالا جہاں ایک ہی طرف سے جنگ کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ خیمے نصب کر لئے۔ اس وقت آپ کے ساتھ پینتالیس سوار اور سو کے قریب پیدل تھے۔

دریں اثناء عبید اللہ نے عمرو بن سعد کو جو کوفہ کا گورنر تھا، بلا یا اور اس سے کہا کہ اس شخص کے معاملے میں میری مدد کریں۔ اس نے کہا، مجھے تو معاف ہی رکھئے۔ ابن زیاد نہ مانا۔ اس پر عمرو بن سعد نے کہا، ”پھر ایک شب سوچنے کی مہلت تو دے دیجئے“ اس نے کہا، ٹھیک ہے، سوچ لو۔ ابن سعد نے رات بھر سوچنے کے بعد آمادگی کی اطلاع دے دی۔

اب عمرو بن سعد حضرت حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے اس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ دیکھو تین باتوں میں سے ایک بات منظور کر لو: (۱) یا مجھے کسی اسلامی سرحد پر چلے جانے دو، (۲) یا مجھے موقعہ دو کہ میں براہ راست یزید کے پاس پہنچ جاؤں (۳) اور یا پھر یہ کہ جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں۔

ابن سعد نے یہ تجویز منظور کیا کہ بہا کی بجائے یزید بھیجے، سامنے رکھ دیا گیا۔ ادھر ابن سعد بھی حضرت کے گھر دار کو لے کر ابن زیاد کے پاس پہنچ گیا۔ ان کا صرف ایک لڑکا بچا رہ گیا تھا اور وہ بچہ علی بن الحسینؑ زین العابدین تھے جو روایت کے راوی ابو جعفر الباقر کے والد تھے۔ یہ عورتوں کے ساتھ اور بیمار تھے۔ ابن زیاد نے حکم دیا اس بچے کو بھی قتل کر دیا جائے۔ اس پر ان کی پھوپھی حضرت زینب بنت علیؑ اس کے اوپر گر پڑیں اور فرمایا کہ جب تک میں قتل نہ ہو جاؤں گی اس بچے کو قتل نہ ہونے دوں گی۔ اس

صورتِ حال کے نتیجے میں ابن زیاد نے اپنا یہ حکم واپس لے لیا اور بعد میں اسیرانِ جنگ کو یزید کے پاس بھیج دیا۔

جب حضرت حسینؑ کے یہ بچے کچھ افرادِ خانہ یزید کے دربار میں پہنچے تو چند درباریوں نے حسب دستور یزید کو تہنیتِ فتح پیش کی۔ ان میں سے ایک شخص نے یہاں تک جسارت کر ڈالی کہ ایک لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا ”امیر المؤمنین! یہ مجھے دے دیجئے“۔ یہ سن کر حضرت زینبؓ بنت علیؑ نے کہا ”بخدا! یہ نہیں ہو سکتا، بجز اس صورت کے کہ یزید دینِ الہی سے نکل جائے“۔ پھر اس شخص نے دوبارہ کہا تو یزید نے اسے ڈانٹ دیا۔

اس کے بعد یزید نے ان سب کو محلِ سرا میں بھیج دیا۔ پھر ان کو تیار کرا کے مدینہ روانہ کروا دیا۔ جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو خاندانِ عبدالمطلب کی ایک عورت سر چلتی اور روتی ہوئی ان سے ملنے کے لئے آئی اور اس کی زبان پر یہ اشعار تھے۔

ماذا تقولون ان قال النبی لکم	ماذا فعلتم وانتم اخر الامم
بعتری وباہلی بعد مفتدی	منہم اساری وقتلی ضر جوابلم
ماکان ہذا جزائی اذ نصحت لکم	ان تخلفو فی بشر فی فوی رحمی

(اس روایت کو حافظ ابن حجر العسقلانی نے ”تہذیب التہذیب“ میں نقل کیا ہے)

